باسمہٖ تعالیٰ

قتلِ مرتد

غلام اور لونڈیاں

اور

یتیم پوتے کی وراثت

ناشران: ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان آزاد پیدا ہوتا ہے، لیکن جو لوگ، کسی نہ کسی طرح، دولت اور اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں وہ انسانوں کی آزادی چھین کر، انہیں اپنا غلام اور محتاج بنا لیتے ہیں۔ قرآن کریم اس لئے آیا کہ وہ انسانوں کی چھنی ہوئی آزادی، انہیں واپس دے۔ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کی روشنی میں ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جس میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم اور محتاج نہیں تھا اور سوائے ان حدود کے جو اللہ نے انسانوں پہ عائد کی تھیں، اور جن سے مقصد انسان کی ذات کی نشوونما اور انسانی معاشرہ میں امن و سلامتی کا قیام تھا، کسی پہ کوئی پابندی عائد نہیں تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد معاشرہ کا نقشہ بدل گیا اور دولت اور اقتدار پھر انسانوں کے ہاتھ میں آ گئے، جس سے ارباب قوت و ثروت نے انسانوں کو اپنا محکوم اور محتاج بنا لیا۔ محکوم اور محتاج ہی نہیں بلکہ غلام (SLAVES)۔ چنانچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک ایک خلیفہ کے حرم میں ہزاروں لونڈیاں ہوتی تھیں۔ دارالخلافہ میں باقاعدہ منڈیاں تھیں جن میں انسان نیلام ہوتے تھے۔ مردوں کو غلام بنایا جاتا تھا اور عورتوں کو لونڈیاں۔ اور طرفہ تماشا یہ کہ ارباب مذہب نے اس کے متعلق فتویٰ دے رکھا تھا کہ یہ سب کچھ "شریعت" کی رُو سے جائز ہے۔

یہ کچھ ارباب حکومت کی طرف سے ہوتا تھا۔ دوسری طرف ارباب شریعت تھے، جن کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ جس شخص نے ان سے کسی معاملہ میں ذرا سا اختلاف کیا، انہوں نے کہہ دیا کہ وہ مرتد ہو گیا۔ اور چونکہ مرتد کی سزا قتل ہے، اس لئے اسے تہ تیغ کر دیا۔ ہماری تاریخ کے صفحات ان خونی داستانوں سے رنگین ہیں۔

تشکیل پاکستان کے بعد، جب اس کے امکانات روشن ہوئے کہ یہاں اسلامی قوانین رائج ہوں گے تو بعض لوگوں نے یہ سوال کیا کہ کیا یہاں غلامی کو رائج کیا جائے گا اور مذہبی اختلاف پر مسلمانوں کو قتل کر دیا جائے گا؟ اس کے جواب میں ہمارے قدامت پرست طبقہ کے نمائندہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے نہایت شد و مد سے لکھا کہ جب یہاں اور قوانین شریعت نافذ ہوں گے تو غلامی اور قتل مرتد کے متعلق "احکام شریعت" کیوں رائج نہیں ہوں گے؟

ان کے ان مضامین کے جواب میں طلوع اسلام میں تفصیلی مقالات لکھے گئے جن میں بتایا گیا کہ غلامی اور قتل مرتد قرآن کریم کی تعلیم کے یکسر خلاف ہیں اس لئے اسلام میں ان کی اجازت کس طرح ہو سکتی ہے؟ ان مضامین کی اہمیت کے پیش نظر انہیں بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔ وہ کتاب مدت سے نایاب تھی۔ چنانچہ اسے، بہ نظر ثانی، دوبارہ شائع کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصد ارباب فکر و نظر کے سامنے اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کے

نزدیک "اسلامی قوانین" سے مراد کیا ہے اور اگر پاکستان میں وہ قوانین نافذ کئے گئے جنہیں یہ حضرات "اسلامی" قرار دیتے ہیں، تو ملک کا نقشہ کیا ہوگا اور دنیا کے سامنے ہماری پوزیشن کیا؟ واضح رہے کہ یہ دو عنوان محض بطور مثال سامنے لائے گئے ہیں، ورنہ جن امور کو یہ حضرات "اسلامی قوانین" قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کریم کے خلاف ہیں اور جن کی وجہ سے اسلام پر آئے دن اعتراضات ہوتے رہتے ہیں۔

جس کتاب کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس میں تیسرا مقالہ "یتیم پوتے کی وراثت" سے متعلق تھا۔ ان حضرات کے "قانونِ شریعت" کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی بچے کا باپ اس (بچے) کے دادا کی زندگی میں وفات پا جائے تو اس یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے حصہ نہیں مل سکتا۔ طلوعِ اسلام نے اس کی بھی وضاحت کی کہ یہ فیصلہ سراسر قرآن کریم کے خلاف ہے۔ للہ الحمد کہ اب ملک کے قانون نے، یتیم پوتے کے حقِ وراثت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس بنا پر اس مقالہ کو درجِ کتاب کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

ہمیں امید ہے کہ اربابِ بصیرت ان مقالات کو، اسلامی اور انسانی نقطۂ نگاہ سے مفید پائیں گے۔ طلوعِ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ کوئی قانون جو قرآن کریم کے خلاف ہو، وہ کبھی اسلامی قانون نہیں قرار پا سکتا۔ اور یہی وہ دعوت ہے جس کی بنا پر اس کی اس قدر مخالفت ہوتی ہے۔ والسلام

لاہور - جون - ۱۹۶۲ء

ادارۂ طلوعِ اسلام

مجوّزہ شریعت بل کے پیشِ نظر "یتیم پوتے کی وراثت" کا مضمون دوبارہ شاملِ کتاب کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی علامہ محمد اسلم جیراجپوری اور علامہ تمنا عمادیؒ کے اس موضوع پر مقالات بھی شاملِ کتاب کر دیئے گئے ہیں۔

دسمبر ۱۹۸۶ء

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (ادارہ)

قتلِ مرتد

محشرستانِ "حکومتِ الٰہیہ" کا ایک خونچکاں منظر!

قرآن نے انسان اور کائنات کی دیگر اشیاء میں ایک بنیادی فرق بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اشیائے کائنات ایک لگے بندھے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ انھیں قطعاً اس کا اختیار نہیں کہ وہ جی چاہے تو اس قانون کے مطابق سرگرمِ عمل رہیں اور جی چاہے تو کسی اور روش پر چل نکلیں۔ پانی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کبھی نشیب کی طرف جائے اور کبھی جی میں آئے تو فراز کی طرف بہنے لگ جائے۔ آگ کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ کبھی حرارت دینے اور کبھی ٹھنڈک پہنچانے لگ جائے۔ اگر کبھی زمین اپنے راستے سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹ جائے۔ اگر سورج اپنی رفتار میں ایک ثانیہ کی بھی تبدیلی پیدا کرلے۔ اگر ہوائیں اپنے رخ کو طرفۃ العین کے لئے خلافِ قاعدہ بدل لیں۔ غرضیکہ اس محیر العقول کارگہِ عالم کا چھوٹے سے چھوٹا پرزہ بھی اپنے نظام سے سرتابی اختیار کرلے تو یہ عظیم الشان سلسلۂ کائنات درہم برہم ہوجائے۔ زندگی اور اس کی ممکنات اس بنا پر قائم ہیں کہ خارجی کائنات کی ہر شے ایک خاص قانون کے ماتحت چل رہی ہے۔ سبح للہ ما فی السمٰوٰت والارض۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اللہ کے قانون کے مطابق سرگرمِ سعی و عمل ہے۔ للہ یسجد من فی السمٰوٰت والارض۔ ہر شے اس کے حکم کے سامنے سجدہ ریز ہے کل لہ قانتون۔ کسی کو اس کے قانون سے مجالِ سرتابی اور یارائے سرکشی نہیں۔

انسانی اختیار و ارادہ جہاں تک ضابطۂ زندگی کا تعلق ہے، انسان کو بھی اسی طرح قانونِ ہدایت دیدیا گیا جس طرح دیگر اشیاءِ کائنات کو۔ لیکن (اور یہ لیکن بہت اہم ہے) انسان کو اس کے ساتھ ہی یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ چاہے تو اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اسے چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کرلے۔ آدم کو اس دنیا میں بھیجنے کے ساتھ ہی کہدیا گیا کہ

فاما یاتینکم منی ھدًی فمن تبع ھُدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ (۲/۳۸)

جب میری طرف سے تمہارے پاس ضابطۂ ہدایت آئے تو جو اس قانونِ ہدایت کی اتباع کرے گا اسے نہ خوف ہوگا نہ حزن۔

ان کے برعکس

والذین کفروا وکذبوا بایٰتنا اولٰئک اصحٰب النار ھم فیھا خالدون (۲/۳۹)

اور جو لوگ اس ضابطۂ ہدایت سے انکار کرینگے ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا جس میں وہ رہیں گے۔

یہ دونوں راہیں بالکل واضح ہیں۔ اس کے بعد انسان پر کوئی جبر نہیں کہ وہ کونسی راہ اختیار کرے۔ وھدینہ النجدین (۹۰/۱۰) "ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں"۔ اسے گوشِ ہوش اور دیدۂ اعتبار عطا کر دیئے ہیں (فجعلنٰہ سمیعًا بصیرا۔ ۷۶/۲) اسے راستہ دکھا دیا ہے (انا ھدینہ السبیل۔ ۷۶/۳) اس کے بعد

اما شاکرًا و اما کفورًا (۷۶/۳)

وہ چاہے تو اسے اختیار کرے۔ چاہے اس سے انکار کر دے

اس باب میں اس پر کوئی زبردستی نہیں۔ جبر نہیں۔ استبداد نہیں۔

ایمان اور کفر کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں

ضابطۂ خداوندی کے مطابق راہ اختیار کرنے کا نام قرآن کی اصطلاح میں ایمان ہے اور اس کے خلاف روشِ زندگی کا نام کفر ہے۔ ایمان کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے ضابطۂ ایمان کے اپنے تقاضے ہیں۔ جو اس راہ کو اختیار کرے گا اس کیلئے ان ضوابط کی پابندی لازمی ہوگی۔ لیکن اس باب میں کوئی زبردستی نہیں کہ ان ضابطۂ ایمان کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے یا ضابطۂ کفر کے مطابق۔ بالفاظِ دیگر انسان کو یہ پورا پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ ایمان اختیار کرے یا کفر۔ یعنی ایمان اور کفر کے معاملے میں انسان پر کوئی زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ یہ قرآن کا صاف، واضح اور غیر مبہم فیصلہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

وقل الحق من ربکم فمن شآء فلیؤمن ومن شآء فلیکفر (۱۸/۲۹)

ان سے کہہ دو کہ تمہارے رب کی طرف سے حق (کھل کر سامنے) آگیا۔ اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کر لے۔

"فمن شآء فلیؤمن ومن شآء فلیکفر" ضابطۂ قرآنی کا عمودی فیصلہ ہے جس کی بنیادوں پر اس کی تعلیم کی تمام عمارت اٹھتی ہے۔ جو ایمان کی راہ اختیار کرے گا وہ اس نظامِ خداوندی کے ثمرات و برکات سے فیض یاب ہوگا۔ جو اس کے خلاف روش پہ چلے گا وہ اس کے عواقب و آلام سے دوچار ہوگا۔ فمن اھتدی فلنفسہ ومن ضل فانما یضل علیھا (۳۹/۴۱) "جو راہِ ہدایت پر چلے گا تو اس کا فائدہ خود اس کو پہنچے گا اور جو گمراہ ہوگا تو اس گمراہی کا وبال اسی پر پڑے گا"۔ وہ کہتا ہے کہ اگر انسانوں کو زبردستی ایک خاص راہ (ضابطۂ ہدایت) پر چلانا مقصود ہوتا تو اللہ تعالیٰ انہیں بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح اختیار و ارادہ سے معطل کر کے، اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور پیدا کر دیتا۔ خدا کے لئے یہ کیا مشکل تھا لیکن خدا کی مشیت نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا پروگرام ہی یہ تھا کہ انسان کو اختیار و ارادہ دیدیا جائے۔ اختیار و ارادہ دے کر اسے پھر زبردستی ایک خاص روش کا پابند بنانا بھی منشائے خداوندی نہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ سے کہہ دیا کہ تو اگر یہ چاہتا ہے کہ تمام لوگ زبردستی مسلمان بنا دیئے جائیں تو یہ چیز مشیتِ خداوندی کے خلاف ہے۔ اگر اسے یہی مطلوب ہوتا کہ انسان زبردستی مومن بنا دیئے جائیں تو وہ انہیں اختیار و ارادہ عطا ہی نہ کرتا۔

ولو شآء ربک لآمن من فی الارض کلھم جمیعًا۔ افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین (۱۰/۹۹)

اگر تیرے رب کی مشیت میں ہوتا تو روئے زمین کے تمام باشندے ایمان لے آتے۔ (لیکن اللہ نے انھیں مجبور نہیں پیدا کیا)
اس لئے تو کیا لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ ضرور ایمان لے آئیں۔

کفر اور ایمان کے معاملے میں قطعاً زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ اس میں جور و استبداد کو کوئی دخل نہیں۔ اللہ نے انسان کو آنکھیں عطا کر دیں اور باہر سورج کی روشنی عام پھیلا دی۔ اب جس کا جی چاہے آنکھیں کھلی رکھ کر دیکھ بھال کر چلے اور جس کا جی چاہے آنکھیں بند کر کے کنوئیں میں گر جائے۔

قد جاء کم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسہ ومن عمی فعلیھا۔ وما انا علیکم بحفیظ (۶/۱۰۴)

(ان سے کہدو کہ) تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیلیں آچکی ہیں۔ سو جو کوئی اس روشنی میں اپنی آنکھوں سے کام لیتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور جو آنکھیں بند کر کے چلے گا تو اس کا نقصان اسی کو ہوگا۔ میں تم پر نگہبان نہیں مقرر کیا گیا (کہ تمہیں زبردستی ایک خاص راہ پر چلاتا رہوں۔)

اس سے ذرا آگے چل کر فرمایا:

ولو شاء اللہ ما اشرکوا وما جعلناک علیھم حفیظاً وما انت علیھم بوکیل (۶/۱۰۷)

اور اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ اور ہم نے تجھے ان پر نگہبان مقرر نہیں کیا۔ اور نہ تو ان کا وکیل ہے۔

سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی (جن کا تفصیلی ذکر آگے چل کر آتا ہے) اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں اس آیت کے نیچے لکھتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ تمہیں داعی اور مبلغ بنا کر بھیجا گیا ہے اور کوتوال نہیں بنایا گیا۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کر دو اور اظہارِ حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے۔ تم کو نہ اس پر مامور کیا جاتا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو اور نہ تمہاری ذمہ داری اور جوابدہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمہارے حلقۂ نبوت میں کوئی شخص باطل پر نہ رہ جائے۔ . . . . . اگر فی الواقعہ حکمت الٰہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اس کا ایک ہی تکوینی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہیں بنا سکتا تھا؟[۱] (ص ۵۶۰)

حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں قرآن نے ایک ایسی نہج زندگی پیش کی ہے جو انسانیت کی تاریخ میں سنگِ میل (LAND MARK) کا حکم رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب ذہنِ انسانی عہدِ طفولیت میں تھا تو اس وقت ایسے مواقع بھی آجاتے تھے جب اسے ورطۂ حیرت میں ڈال کر سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یعنی خوارقِ عادت (یا معجزات) کی رو سے ذہن پر اثر ڈال کر بات منوانے کی کوشش۔ لیکن اس نے کہا کہ اب انسان اپنے عہدِ شعور میں آ پہنچا ہے اس لئے اب معجزات کے ذریعے سے اس سے بات نہیں منوائی جائے گی۔ اب ہر بات دلیل و برہان اور بصیرت د

حتیٰ کہ معجزات بھی نہیں

---

[۱] ان تصریحات کو ذرا غور سے دیکھ لیجئے کیونکہ آگے چل کر یہی چیز بحث کا محور بنے گی۔

فراست کی رو سے تسلیم کرائی جائے گی۔ چنانچہ نبی اکرمؐ سے ارشاد ہے کہ

لعلک باخع نفسک الا یکونوا مومنین۔ ان نشأ ننزل علیہم من السماء اٰیۃ فظلت اعناقہم لہا خاضعین (۲۶/۳)

تو تو شاید اپنے آپ کو ہلاک کرلے گا کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ (اگر ہم چاہتے کہ یہ زبردستی ایمان لے آئیں تو ہمارے لئے یہ کونسا مشکل کام تھا کہ ہم آسمان سے ایک نشان نازل کردیتے تو اس کے سامنے ان سب کی گردنیں جھک جاتیں۔

لیکن یہ ذہنی استکراہ ہوجاتا۔ اس لئے قرآن نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ نبی اکرمؐ کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا۔ اب معجزات کا دور ختم ہوگیا[1]۔ اب ہر دعوے کا ثبوت، دلائل و براہین سے پیش کیا جائے گا۔ اب دعوت الی اللہ علیٰ وجہ البصیرت ہوگی۔

قل ھٰذہ سبیلی۔ ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی۔ . . . . . (۱۲/۱۰۸)

ان سے کہدو کہ یہ ہے میرا راستہ۔ میں اور میرے متبعین علیٰ وجہ البصیرت خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

ہماری دعوت غور و فکر کی دعوت ہے۔ تدبر و تفکر کی دعوت ہے۔ ہماری اپیل عقل و بصیرت اور فہم و فراست سے ہے۔ اس میں کسی قسم کے جور و اکراہ کو دخل نہیں۔ ایمان کے معاملے میں نہ ذہنی استکراہ کو کچھ دخل ہوگا نہ طبعی قوت (PHYSICAL FORCE) کو کوئی واسطہ۔

کوئی استبداد نہیں

قرآن کفر و ایمان کے معاملے میں طبعی قوت (استبداد) کے استعمال کو انسانیت کے خلاف سنگین جرم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ سرخیلِ طائفۂ مستبدین، یعنی فرعونِ مصر کے خلاف جو فردِ جرم اس نے مرتب کی ہے اس میں واضح طور پر بتادیا ہے کہ وہ کفر و ایمان کے معاملے میں استبداد سے کام لیتا تھا۔ چنانچہ . . . . . جب اس کے دربار کے ساحرین حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئے تو اس نے گرج کر کہا کہ ءامنتم بہ قبل ان اٰذن لکم (۲۶/۴۹) کیا تم میری اجازت سے پہلے ہی اس پر ایمان لے آؤ گے؟" تم نے کفر اور ایمان کے معاملے میں اپنے فیصلے ہی کو قولِ فیصل سمجھ لیا اور نہیں دیکھا کہ اس باب میں میری منشاء کیا ہے؟ اچھا فلسوف تعلمون (۲۶/۴۹) تمہیں ابھی معلوم ہوجائے گا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ لاقطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف ولاصلبنکم اجمعین (۲۶/۴۹)[2]۔ تمہارے ہاتھوں اور پاؤں میں الٹی ہتھکڑیاں ڈلواتا ہوں (یا انہیں کٹواتا ہوں) اور اس کے بعد تم سب کو سولی پر چڑھاتا ہوں۔" یہ تھا وہ فرعونی حکم جسے قرآن نے اُس کے سنگین جرائم کی فہرست میں گنوایا ہے۔ اور یہ ایک فرعونِ مصر ہی پر کیا موقوف تھا۔ تمام فراعنۂ دہر اور جبابرۂ عصر اپنے اپنے وقتوں میں یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ قومِ شعیب نے حضرت شعیبؑ سے یہی کہا تھا کہ "ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی بستی سے باہر نکال دیں گے۔ اولتعودن فی ملتنا (۷/۸۸)" یا تمہیں ہمارے مذہب میں واپس آنا ہوگا۔" یہ روش ہر رسولؑ کے خلاف اختیار کی گئی۔

وقال الذین کفروا لرسلھم لنخرجنکم من ارضنا اولتعودن فی ملتنا (۱۴/۱۳)

ارباب کفر نے اپنے رسولوں سے یہی کہا کہ یا ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دینگے یا تمہیں ہمارے مذہب میں واپس آجانا ہوگا۔

---

[1] اس کی تفصیل معراج انسانیت (مصنفہ پرویز صاحب) باب "معجزات" میں دیکھئے۔
[2] قطع یں کے معنی ہاتھ روک دینا (ہتھکڑیاں ڈالنا) بھی ہوسکتا ہے۔

یعنی اگر یہاں رہنا چاہو تو ہمارے مذہب میں پھر سے واپس آجاؤ۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ہم تمہیں یہاں نہیں رہنے دیں گے۔

قرآن نے امم سابقہ کی فہرستِ جرائم میں اس جرم کو نمایاں حیثیت دیکر یہ واضح کردیا کہ کفر اور ایمان کے معاملے میں جبر و استبداد انسانیت کے خلاف بدترین جرم ہے۔ اس لئے کہ اللہ نے اس باب میں انسان کو اختیار و ارادہ دیا ہے۔ اب اس کے اس اختیار و ارادہ کو سلب کرلینا، خدا کے فیصلے کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت اور شرفِ آدمیت کا سلب و نہب ہے۔ اس نے اس باب میں یہاں تک تاکید کردی کہ

وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلم اللہ۔ ثم ابلغہ مامنہ ذلک بانھم قوم لا یعلمون (9/6)

اگر (جنگ کی حالت میں) ان مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اسکی امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

حالتِ جنگ میں بھی زبردستی نہیں کی جاسکتی

یعنی حالتِ جنگ میں بھی کسی کو بہ جبر و اکراہ مسلمان نہ بناؤ۔ مشرک کو قرآن سناؤ۔ پھر اسے اس کے مامن و مسکن تک بحفاظت پہنچا دو۔ اور اس طرح اسے مہلت دو کہ وہ تمہاری سنائی ہوئی بات (قرآن) پر غور و فکر کرے اور اس کے بعد، اگر اس کا دل جھکے تو اس پر ایمان لے آئے۔ بلا علم و بصیرت ایمان لانے سے کچھ حاصل نہیں۔ اس لئے کہ ایمان کا تعلق یکسر انسان کے قلب سے ہے۔ جب تک انسان کا قلب مطمئن نہیں ہوتا، اس میں ایمان داخل ہی نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ وہ لوگ جو مسلمانوں کی فتوحات سے متاثر ہوکر ان کی جماعت میں شامل ہوگئے تھے وہ انہیں بھی کھلے کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ اپنے آپ کو مؤمن مت کہو ولما یدخل الایمان فی قلوبکم (49/14) اسلئے کہ ہنوز ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا۔ اور کفر ہو یا ایمان، اس کا تعلق اعماقِ قلب سے ہے۔ یہ اقرار جب تک دل کی گہرائیوں سے نہیں پھوٹتا، اقرار کہلا ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کہدیا کہ اگر کسی شخص سے زبردستی کفر کا اقرار لے لیا جائے درآنحالیکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو تو اس کا اس قسم کا اقرار اُسے کافر نہیں بنا دیتا۔ من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان (16/106) جسے کفر پر مجبور کردیا جائے حالانکہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، تو وہ کافر نہیں ہوجاتا۔

لا اکراہ فی الدین

لہذا قرآن نے سارے دنیا پر نور کے حروف سے لکھدیا کہ

لا اکراہ فی الدین۔ قد تبین الرشد من الغی۔ (2/256)

دین کے معاملے میں کسی قسم کا جبر اور اکراہ جائز نہیں۔ ہدایت اور گمراہی ایک دوسرے سے متمیز ہوچکی ہے۔

فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر۔ جس کا جی چاہے ایمان اختیار کرے، جس کا جی چاہے کفر کی راہ پر چلے۔ لست علیھم بمصیطر۔ تم ان پر داروغہ مقرر نہیں کئے گئے کہ انہیں زبردستی مسلمان بناؤ۔

یہ ہے قرآن کی تعلیم جس میں کوئی ابہام نہیں، کسی قسم کی گنجلک نہیں، کوئی پیچیدگی نہیں، کہیں ذرا سا شک و شبہ نہیں۔ لیکن قرآن کی اس قدر کھلی کھلی اور واضح تعلیم کے خلاف ہمارے مولوی کا مذہب یہ ہے کہ

مُلا کا مذہب

من بدل دینہ فاقتلوہ (روایت)

جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اسے قتل کر دو۔

اور اس مذہب کے متعلق، امیر جماعت اسلامی، سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا ارشاد ہے کہ کامل بارہ سو برس تک یہ امت کا متفق علیہ مسئلہ رہا ہے۔ چنانچہ وہ "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" میں لکھتے ہیں:

> یہ بات اسلامی قانون کے کسی واقف کار آدمی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام میں اس شخص کی سزا قتل ہے جو مسلمان ہو کر پھر کفر کی طرف پلٹ جائے۔ اس باب میں پہلا شک جو مسلمان کے اندر پیدا ہوا وہ انیسویں صدی کے دور آخر کی تاریک خیالی کا نتیجہ تھا۔ ورنہ اس سے پہلے کامل بارہ سو برس تک یہ تمام امت کا متفق علیہ مسئلہ رہا ہے اور ہمارا پورا دینی لٹریچر شاہد ہے کہ قتل مرتد کے معاملے میں مسلمانوں کے درمیان کبھی دو رائیں نہیں پائی گئیں۔ (ص۸)

مودودی صاحب کے ارشادات

یعنی مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق لا اکراہ فی الدین (دین کے معاملے میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں) کا ارشاد تو انیسویں صدی کے دور آخر کی "تاریک خیالی" کا نتیجہ ہے۔ اور دین بدلنے والے کو سولی چڑھا دینے (لاصلبنکم) کا "فرعونی حکم" (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) اسلام کے درخشندہ عہد کی یادگار ہے۔

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر زخاک — سر برآر و ایں قیامت درمیان خلق بیں!

کفر اور ایمان کے معاملے میں قرآن نے جو بنیادی تعلیم پیش کی ہے اسے آپ تفصیلی طور پر گذشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔ وہ اس باب میں ذرا سا بھی جبر و اکراہ گوارا نہیں کرتا چہ جائیکہ وہ دین بدلنے والے کو حوالۂ تیغ کر دے۔ لیکن مودودی صاحب نے اپنی "تحقیق" کا آغاز اس عنوان سے کیا ہے

حکم قتل مرتد کا ثبوت قرآن سے

یقیناً ہر وہ شخص جو دین میں قرآن کو حجت مانتا ہے اس عنوان کو دیکھ کر رک جائے گا۔ کیونکہ ایک طرف وہ دیکھ چکا ہے کہ دین کے معاملے میں قرآن کس قدر وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا اکراہ نہیں۔ اور دوسری طرف اسے یہ عنوان دکھائی دیتا ہے کہ قرآن مرتد کے قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا یہ مقام فی الواقعہ بڑے غور و فکر سے دیکھنے کا ہے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں:

> ذرائع معلومات کی کمی کی وجہ سے جن لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ ہے کہ شاید اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہ ہو، اور بعد کے "مولویوں" نے یہ چیز اپنی طرف سے اس دین میں بڑھا دی ہو، ان کو اطمینان دلانے کے لئے میں مختصراً اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔ (ص۹)

مودودی صاحب کی قرآنی دلیل

ہم اس بات کو ذرا آگے چل کر بیان کریں گے کہ قرآن کی ایسی کھلی ہوئی تعلیم کے خلاف "مولویوں" نے کس مقصد کیلئے قتلِ مرتد کا حکم وضع کیا اور اسے کس مطلب کے لئے اسلام میں داخل کیا۔ اس وقت صرف یہ دیکھئے کہ مودودی صاحب اس باب میں قرآن سے کیا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ دیکھئے اور ان کی جرأت اور جہالت کا ماتم کیجئے۔ فرماتے ہیں:

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

فان تابوا واقاموا الصلوٰة واٰتوا الزکوٰة فاخوانکم فی الدین ونفصّل الاٰیات لقوم یعلمون . وان نکثوا ایمانھم من بعد عھدھم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا ائمة الکفر انھم لا ایمان لھم لعلھم ینتھون (التوبہ ۱۲-۱۱)

پھر اگر وہ (کفر سے) توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ ہم اپنے احکام ان لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کر رہے ہیں جو جاننے والے ہیں۔ لیکن اگر وہ عہد (یعنی قبول اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر زبان طعن دراز کریں تو پھر کفر کے لیڈروں سے جنگ کرو۔ کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاید کہ وہ اس طرح باز آجائیں۔

مودودی صاحب نے قرآن سے صرف یہی آیت پیش کی ہے۔ کوئی اور آیت اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش نہیں کی۔ اس آیت کا مندرجۂ صدر ترجمہ بھی انہی کا ہے۔ اب اس کی تفسیر بھی انہی کی زبان سے سنئے۔ فرماتے ہیں:

یہ آیت سورۂ توبہ میں جس سلسلے میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ سنہ ۹ھ میں حج کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اعلانِ برأت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس اعلان کا مفاد یہ تھا کہ جو لوگ اب تک خدا اور رسول سے لڑتے رہے ہیں اور ہر طرح کی زیادتیوں اور بدعہدیوں سے خدا کے دین کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ان کو اب زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس مدت میں وہ اپنے معاملے پر غور کرلیں۔ اسلام قبول کرنا ہو تو اسلام قبول کرلیں معاف کر دیئے جائیں گے۔ ملک چھوڑ کر نکلنا چاہیں تو نکل جائیں مدتِ مقررہ کے اندر ان سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد جو لوگ ایسے رہ جائیں گے جنہوں نے نہ اسلام قبول کیا ہو نہ ملک چھوڑا ہو ان کی خبر تلوار سے لی جائے گی۔ اس سلسلے میں فرمایا گیا کہ "اگر وہ توبہ کرکے ادائے نماز و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد وہ پھر اپنا عہد توڑ دیں تو کفر کے لیڈروں سے جنگ کی جائے گی"۔ یہاں عہد شکنی سے مراد کسی طرح بھی سیاسی معاہدات کی خلاف ورزی نہیں لی جاسکتی بلکہ سیاق عبارت صریح طور پر اس کے معنی "اقرارِ اسلام سے پھر جانا" متعین کر دیتا ہے اور اس کے بعد فقاتلوا ائمة الکفر کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتے کہ تحریکِ ارتداد کے لیڈروں سے جنگ کی جائے۔ (صفحہ ۹)

مودودی صاحب نے جب آیۂ مندرجۂ صدر کی یہ تفسیر اپنے مریدوں کے حلقے میں بیان فرمائی ہوگی تو یقیناً وہ جھوم اٹھے ہوں گے اور اس کے بعد فضا میں اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہوں گی:

ایک ـــ دیکھا! حضرت صاحب نے آج کیسا انوکھا نکتہ بیان فرمایا ہے۔ ہم ہر روز اس آیت کی تلاوت کرکے آگے بڑھ جاتے تھے لیکن کبھی ذہن اس طرف نہیں گیا کہ اس سے قتلِ مرتد کا حکم بھی نکل سکتا ہے۔

دوسرا ـــ اجی صاحب ایک ہم ہی پر کیا موقوف ہے۔ تیرہ سو برس سے مسلمان اس آیت کو پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ سینکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں۔ ہم نے آج تک کسی جگہ یہ نکتہ دیکھا ہی نہیں۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ!!

تیسرا ـــ بھئی یہ باتیں کتابوں سے حاصل نہیں ہوتیں۔ اس کے لئے خدا اور رسول کا مزاج شناس ہونا ضروری ہے۔ یہ چیزیں علم لدنی سے ملتی ہیں۔ ہر ایک کے نصیب میں کہاں۔

لیکن آپ ارادتمندوں کے اس حلقے سے ذرا باہر نکل کر عقل و بصیرت کی روشنی میں غور کیجئے کہ کیا اس آیت کو کسی طرح بھی یہ معنی پہنائے جا سکتے ہیں! یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب اُس قرآنی مملکت کی تکمیل ہو رہی تھی جس کی بنیاد بائیس سال پہلے نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے اُسی سرزمین میں (نہایت بے سروسامانی کی حالت میں) رکھی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں مسلم اور غیر مسلم دونوں آباد ہوں گے۔ مسلمانوں سے کسی قسم کے معاہدے کی ضرورت نہیں تھی ـ یہ مملکت خود انہی کی قائم کردہ تھی . . . . البتہ غیر مسلموں سے معاہدہ ضروری ہوکہ وہ حدودِ مملکت کے اندر امن و سلامتی سے رہیں گے جب تک وہ اس معاہدے پر قائم رہیں گے انہیں ہر قسم کی حفاظت (جان، مال، آبرو، معابد کی حفاظت) کی ضمانت دی جائے گی لیکن اگر وہ عہد شکنی کرکے مملکت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں تو ان سے لامحالہ جنگ کی جائے گی۔ یہ وہ اصول ہے جس کی تصریح قرآن نے متعدد مقامات پر کی ہے۔ یہی صورت ۹ھ میں کفار مکہ کے معاملے میں پیش آئی۔ قرآن نے اعلان کر دیا کہ ان کے لئے دو صورتیں ہیں:

آیت کا صحیح مفہوم

(i) یہ لوگ مسلمان ہو کر مملکتِ اسلامیہ کا جزو بن جائیں۔

(ii) یا غیر مسلم رہتے ہوئے امن و سلامتی کے معاہدے پر کاربند رہیں۔

لیکن (iii) اگر یہ نہ تو مسلمان ہوں اور نہ ہی . . . . معاہدے کی پابندی کریں تو اس صورت میں اس کے سوا چارہ نہ ہوگا کہ ان سے جنگ کی جائے۔ بات بالکل صاف ہے۔ لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

(الف) اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو تمہارے دین کے بھائی بن جائیں گے۔ لیکن

(ب) "اسلام لانے کے بعد" اگر پھر "اپنے اقرار اسلام" سے پھر جائیں (یعنی مرتد ہو جائیں) تو ان سے جنگ کی جائے۔

قرآن کے الفاظ یہ ہیں وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ۔ مودودی صاحب اس کے معنی بتلاتے ہیں "اگر وہ اسلام لانے کے بعد اپنے اقرارِ اسلام سے پھر جائیں"۔ یعنی ان کے نزدیک عَهْدِهِمْ کے معنی ہیں کفار کا

اقرارِ اسلام" اور نکثوا ایمانھم کے معنی سیاسی معاہدات کو توڑنا نہیں بلکہ مرتد ہو جانا ہے۔ ہم مودودی صاحب کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ سارے قرآن میں کوئی ایک جگہ بھی ایسی دکھا دیں جہاں عہدھم یا ایمانھم کے معنی "لوگوں کا اقرارِ اسلام" ہو۔ اس کے برعکس ہم وہ تمام مقامات دکھا دیں گے جہاں قرآن نے عھد اور ایمان کے الفاظ کو سیاسی معاہدات کے لئے استعمال کیا ہے۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس کے ثبوت میں کوئی دلیل و برہان پیش کرو۔ لا برھان لہ۔ تم دیکھو گے کہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی۔ یہ قرآن ہے۔ مذاق نہیں۔ مودودی صاحب نے آیۂ زیرِ نظر کے ترجمہ میں قوسین میں یہ الفاظ لکھے ہیں (یعنی قبولِ اسلام کا عہد)۔ یہ خالص اپنی طرف سے اضافہ ہے اور افترٰی علی اللہ اور تحریف فی القرآن کی کھلی ہوئی مثال۔

آگے بڑھئے۔ اس آیت میں قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ لوگ عہد اور معاہدے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں تو فقاتلوا ائمۃ الکفر۔ کفر کے ان لیڈروں سے جنگ کرو۔ یہاں لفظ قاتلوا آیا ہے جس کے معنی جنگ کرنا ہے۔ مودودی صاحب اس سے قتلِ مرتد کی دلیل لاتے ہیں۔ اگر اس سے مراد قتل کرنا ہوتا تو اس کیلئے فاقتلوا آنا چاہئے تھا۔ جیسا کہ قرآن میں کئی ایک مقامات پر (قتل کرنے کے لئے) قتل آیا ہے۔ فقاتلوا (جنگ کرنے) کی صورت میں قتل کرنے اور قتل ہو جانے، دونوں کا امکان ہوتا ہے۔ (اسی لئے قتال کے معنی ایک دوسرے کو مارنے کے ہیں)۔

اس کے بعد قرآن نے کفار سے جنگ کرنے کی مزید توجیہ یہ کہہ کر فرما دی کہ انھم لا ایمان لھم۔ کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر ان کا جرم ارتداد ہوتا تو یہ کہنا چاہئے تھا کہ ان کا ایمان نہیں رہا۔

آخر میں فرمایا کہ ان کے ساتھ جنگ کی اجازت اس لئے دی جاتی ہے لعلھم ینتھون۔ تاکہ وہ شاید اس طرح باز آجائیں۔ یعنی مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے معاہدات کی رُو سے پُرامن رہیں۔ اگر وہ عہد شکنی کرتے ہیں تو ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جنگ کے خوف سے، عہد شکنی سے باز آجائیں۔ لیکن اس کے برعکس، اگر اس کے معنی یہ کئے جائیں کہ اگر وہ اسلام لا کر مرتد ہو جائیں تو انھیں قتل کر دو۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں ارتداد سے باز رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ مرتد ہو گئے۔ اس کے بعد انھیں قتل کر دیا گیا۔ اب جسے قتل کر دیا گیا ہو وہ ارتداد سے باز کس طرح آئیگا؟ وہ تو ختم ہو گیا۔

مودودی صاحب نے سورۂ توبہ کی اسی آیت پر اکتفا کر دیا ہے۔ اگر وہ اس سے اگلی آیت بھی ساتھ ہی لکھ دیتے تو مطلب واضح ہو جاتا (لیکن ان کی منشا کے خلاف جاتا)۔ وہ آیت یہ ہے:

الا تقاتلون قوما نکثوا ایمانھم وھموا باخراج الرسول وھم بدءوکم اول مرۃ اتخشونھم فاللہ احق ان تخشوہ ان کنتم مؤمنین۔ (۹/۱۳)

---

[1] واضح رہے کہ یہ لفظ اِیمان نہیں بلکہ اَیمان ہے۔ اَیمان۔ یمین کی جمع ہے اور اس کے معنی قسم یا معاہدے کے ہیں۔ اِیمان اس سے الگ لفظ ہے۔

کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنھوں نے اپنے عہد و پیمان توڑ ڈالے۔ جنھوں نے اللہ کے رسول کو اس کے وطن سے نکال باہر کرنے کے منصوبے کئے اور پھر تمہارے برخلاف لڑائی میں پہل بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ سزاوار ہے کہ اس کا ڈر تمہارے دلوں میں ہو۔

یہ آیت اس سے پہلی آیت کی تشریح کر دیتی ہے (جسے مودودی صاحب نے نقل کیا ہے) اس میں مزید وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں کے خلاف جنگ کرنے کے اسباب و وجوہ کیا تھے۔ اس میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ

(i) یہ وہی لوگ ہیں جو اس سے قبل معاہدات کو توڑ چکے ہیں۔

(ii) رسول اللہؐ کو مکے سے نکال دینے کے منصوبے باندھ چکے ہیں۔

(iii) کئی بار تمہارے خلاف جنگ میں پہل کر چکے ہیں۔

یہ ہے وہ فردِ جرم جو قرآن نے ان لوگوں کے خلاف مرتب کی ہے آپ غور کیجئے کہ اس میں سیاسی معاہدات کے توڑنے کا ذکر ہے یا اسلام لانے کے بعد مرتد ہو جانے کا ذکر؟ ان آیات میں کوئی قرینہ یا شائبہ بھی اس امر کا نہیں کہ ایمان کو کفر سے بدل دینے کو جرم قرار دے کر اس کی سزا موت تجویز کی جا رہی ہو۔

بہر حال یہ ہے وہ ثبوت جو مودودی صاحب نے "قتلِ مرتد" کے متعلق قرآن سے پیش کیا ہے۔ ان کی پیش کردہ آیت پر ایک مرتبہ پھر غور کرو (اس کے بعد ان تمام آیات کو ایک مرتبہ پھر سامنے لاؤ جو دین کے معاملے میں جبر و اکراہ کے خلاف، سابقہ صفحات میں لکھی جا چکی ہیں) اور پھر سوچو کہ کیا اس آیت سے کسی طرح بھی قتلِ مرتد کا ثبوت بہم پہنچتا ہے؟ ثبوت بہم پہنچنا تو ایک طرف، یہ سوچو کہ اس آیت کا اس موضوع (قتلِ مرتد) کے ساتھ کوئی تعلق بھی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب نے یہ آیت محض تکلفاً لکھ دی ہے (جس طرح رسماً خط کے اوپر ۷۸۶ لکھ دیا جاتا ہے حالانکہ اس کا نفسِ مضمون سے کچھ تعلق نہیں ہوتا اور نہ ہی لکھنے والے کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ وہ فی الواقعہ خط کا آغاز خدا کے نام سے کرتا ہے)۔ ورنہ وہ اپنے دل میں اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن نے کہیں مرتد کی سزا قتل تجویز نہیں کی۔ چنانچہ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

قرآن نہیں بلکہ روایات اور فقہ

بعض لوگ حدیث اور فقہ کی باتیں سن کر یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ قرآن میں یہ سزا کہاں لکھی ہے۔ ایسے لوگوں کی تسلی کیلئے اگرچہ ہم نے اس بحث کی ابتداء میں قرآن کا حکم بھی بیان کر دیا ہے۔ لیکن اگر بالفرض یہ حکم قرآن میں نہ بھی ہوتا تو حدیث کی کثیر التعداد روایات۔ خلفائے راشدین کے فیصلوں کی نظیریں اور فقہاء کی متفقہ رائیں اس حکم کو ثابت کرنے کیلئے بالکل کافی تھیں۔ ثبوتِ حکم کے لئے ان چیزوں کو ناکافی سمجھ کر جو لوگ اس کا حوالہ قرآن سے مانگتے ہیں ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا تمہاری رائے میں اسلام کا پورا قانونِ تعزیرات وہی ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو گویا تم یہ کہتے ہو کہ قرآن میں جن افعال کو جرم قرار دے کر سزا تجویز کر دی گئی ہے ان کے ماسوا کوئی فعل اسلامی حکومت میں جرم مستلزم سزا نہ ہو گا۔ (ص ۳۰-۳۱)

اب آئے مولوی صاحب اپنے اصل موقف پر۔ قرآن کی آیت تو محض تبرکاً لکھدی گئی تھی حکم کے لئے حدیث دیکھئے۔ فقہ دیکھئے۔ (اور یہی وہ مقام ہیں جہاں "مزاج شناسی" کی گنجائش نکلتی ہے)۔

یہ درست ہے کہ

(۱) قرآن میں ایسے جرائم کا بھی ذکر ہے جن کی سزا اس نے خود متعین نہیں کی۔ مثلاً خمر، میسرہ، وغیرہ

(۲) ایسے جرائم بھی ہیں جن کا قرآن میں محض اصولی حکم ہے۔ ان کی نوعیت متعین نہیں کی گئی۔ مثلاً نہی عن المنکر کا اصولی حکم۔

قرآن نے ارتداد کو جرم ہی قرار نہیں دیا

لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے (اور بار بار کہتا ہے) کہ کفر اور ایمان کے معاملے میں کسی پر کوئی جبر نہیں کیا جا سکتا۔ کسی حالت میں بھی زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے کفر اور ایمان کا بدلنا کوئی جرم نہیں۔ لیکن اس کے برعکس ایک شخص یہ کہتا ہے کہ ایمان کو کفر سے بدلنے کی قطعاً اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جو ایسا کرے گا وہ ایک سنگین جرم کا مرتکب ہوگا۔ جس کی سزا موت ہے۔ تو کیا ایسا کہنے والا دین کے ضابطۂ تعزیرات کی تکمیل کر رہا ہے یا قرآن کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت کا مرتکب ہو رہا ہے؟ اگر ایسا کہنے والا اپنے دعوے کے ثبوت میں عربی زبان کے چار فقرے پیش کر کے انھیں حدیث۔ صحابہؓ کے فیصلے اور فقہاء کی رائے قرار دیدے تو اس کے قول کو محض اس لئے دین مان لیا جائے گا کہ اس نے عربی کے ان فقروں کی نسبت حضور رسالتمآبؐ، صحابہ کبارؓ اور ائمہ فقہ علیہم الرحمۃ کی طرف کر دی ہے اور ایسا کرنے میں قطعاً نہیں شرمایا! ہم میں نہ آج رسول اللہ موجود ہیں نہ صحابہ کبارؓ اور نہ ہی ائمہ فقہ۔ ہم ان حضرات سے کس طرح تصدیق کریں کہ یہ ارشادات فی الواقعہ ان کے ہیں یا اُن کی طرف غلط منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے برعکس، ہمارے پاس قرآن موجود ہے جس کے محفوظ ہونے کا دعوٰے خود اللہ نے کیا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ اس نے لیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کفر اور ایمان کی تبدیلی کوئی جرم نہیں۔ فرمایئے! ان حالات میں کس کی بات دین کہلائے گی۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ کی بات۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں ہماری بات۔ اس لئے کہ اگرچہ آج ہم میں رسول اللہؐ موجود نہیں لیکن میں رسول اللہؐ کا مزاج شناس[1] تم میں موجود ہوں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ فلاں بات رسول اللہؐ نے فرمائی تھی یا نہیں۔ اور یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اگر آج رسول اللہؐ موجود ہوتے تو وہ اس باب میں کیا فرماتے؟ لہٰذا میری بات کو میری بات نہ سمجھو۔ اسے رسول اللہؐ کی بات سمجھو۔

کوئی اور بولتا ہے یہ میری زباں نہ سمجھو!

لا اکراہ فی الدین کی تفسیر

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ بیشک قرآن میں لا اکراہ فی الدین (دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں) کا حکم موجود ہے لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی غیر مسلم کو جبراً مسلمان نہیں کر سکتے لیکن جو شخص ایک دفعہ مسلمان ہو جائے اسے اس کی اجازت قطعاً نہیں دی جا سکتی کہ وہ اسلام کے حلقے سے باہر نکل جائے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہے گا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ان کا ارشاد ہے:

---

[1] "مزاج شناسی" کے لئے دیکھئے مضمون "مثلاً" جو سال گذشتہ طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا۔

لا اکراہ فی الدین کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کو اپنے دین میں آنے کے لئے مجبور نہیں کرتے۔ اور واقعی ہماری روش یہی ہے۔ مگر جسے واپس آکر جانا ہو اسے ہم پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمد و رفت کے لئے کھلا ہوا نہیں ہے۔ لہذا اگر آتے ہو تو یہ فیصلہ کرکے آؤ کہ واپس نہیں جانا ہے۔ ورنہ براہ کرم آؤ ہی نہیں۔ (ص۵۳)

یعنی اسلام میں صرف (one-way traffic) ہے۔ اس میں داخل ہونے تک تو تمہیں اختیار و ارادہ حاصل ہے لیکن اس کے بعد کفر اور ایمان کے معاملے میں وہ تمام اختیارات جو تمہیں خدا نے دیئے تھے، سب سلب ہو جائیں گے۔ یہ ہے وہ محور جس کے گرد مودودی صاحب کے دعوے کی تمام دلیلیں گردش کرتی ہیں۔ یعنی وہی جواب جو قرآن کے بیان کے مطابق تمام کفار اپنے اپنے رسولوں کو دیا کرتے تھے۔

وقال الذین کفروا لرسلھم لنخرجنکم من ارضنا او لتعودن فی ملتنا۔ ۔ ۔ (۱۴/۱۳)

انکار کرنے والے سرکش اپنے رسولوں سے کہتے تھے کہ یا تو ہم تمہیں اپنے ملک سے باہر نکال دیں گے یا اپنے مذہب میں واپس لے آئیں گے۔

یہی مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ مذہب تبدیل کرنے والے مسلمان کو یا تو ملک چھوڑ کر چلا جانا ہوگا اور یا پھر اسی مذہب میں واپس جانا۔ ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔

اگر کفر و ایمان کے بارے میں قرآن میں صرف وہی آیات ہوتیں جنہیں ہم پہلے لکھ آئے ہیں تو مسئلہ زیر نظر کے سمجھنے کے لئے وہی کافی تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اسلام میں اس قسم کے فتنے بھی اٹھیں گے اس لئے اس نے اس مسئلہ کو یہیں نہیں چھوڑ دیا۔ اس نے اسلام لانے کے بعد پھر۔ کافر ہو جانے والوں کے متعلق بھی، ایک نہیں متعدد مقامات پر صراحت سے ذکر کر دیا۔ مودودی صاحب نے اپنے رسالے میں ان مقامات کو چھوا تک نہیں اس لئے کہ لا یمسہ الا المطھرون۔ جن کے قلب و دماغ عجمیت کی کثافتوں سے آلودہ ہو چکے ہوں وہ قرآن کو کس طرح چھو سکتے ہیں؟ دیکھئے قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے:

مرتد کے متعلق قرآن کی تصریحات

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخاسرین (۳/۸۴)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہشمند ہوگا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائیگا۔ اور آخرت میں وہ تباہ و نامراد ہوگا۔

یہ ہوئے وہ لوگ جنھوں نے اسلام کو اختیار نہیں کیا۔ اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر ہے جو ہدایت پانے کے بعد پھر کفر اختیار کر گئے ان کے متعلق ارشاد ہے:

کیف یھدی اللہ قوما کفروا بعد ایمانھم وشھدوا ان الرسول حق وجاءھم البینٰت۔ واللہ لا یھدی القوم الظٰلمین ٭ اولٰئک جزاؤھم ان علیھم لعنۃ اللہ والملٰئکۃ والناس اجمعین ٭ خالدین فیھا لا یخفف عنھم العذاب ولا ھم ینظرون ٭ الا الذین تابوا من بعد ذالک واصلحوا فان اللہ غفور رحیم (۳/۸۵-۸۹)

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ اس قوم کو ہدایت دیدے جس نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کرلی۔ حالانکہ اس نے گواہی دی تھی کہ اللہ کا رسول برحق ہے۔ اور اس کے سامنے روشن دلیلیں بھی آچکی تھیں۔ اللہ صحیح مقام سے ہٹ جانے والوں پر ہدایت کی راہیں نہیں کھولا کرتا۔

ان لوگوں کے اس عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور انسانوں کی، سب کی، لعنت برس رہی ہے۔ اس حالت ہمیشہ رہیں گے۔ نہ تو ان کا عذاب کبھی کم ہوگا، ورنہ کبھی مہلت پائیں گے۔

لیکن جن لوگوں نے اس حالت کے بعد بھی توبہ کرلی اور اپنے آپ کو سنوار لیا تو بیشک اللہ بخشنے والا، رحمت والا ہے۔

یہ ہے ذکران لوگوں کا جو اسلام لانے کے بعد پھر کفر کی طرف پھر جائیں۔ آپ دیکھئے ان کے متعلق کہیں یہ نہیں لکھا کہ انھیں جرم ارتداد کی سزا میں قتل کردینا چاہیے[1]۔ ان کے متعلق صرف اتنا کہا ہے کہ اسلام کو چھوڑنے سے یہ ان تمام برکات و ثمرات سے محروم ہوجائیں گے جو راہ راست پر چلنے کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسلام کی راہ، کامرانیوں اور شادکامیوں کی راہ ہے اور کفر کی راہ ناکامیوں اور تباہیوں کی راہ۔ یہ اسلام پر قائم رہتے تو کامران وکامیاب زندگی بسر کرتے۔ انھوں نے کفر کی راہ اختیار کرلی تو ان کی کامیابیاں ناکامیوں میں بدل گئیں۔ اب اس کے بعد بھی کچھ نہیں بگڑا جس طرح انھیں اس امر کا اختیار رکھا کہ اسلام لانے کے بعد جی چاہے تو اس کے دائرے سے باہر نکل جائیں، اب بھی انھیں اختیار ہے کہ جی چاہے تو پھر اس کے حلقہ بگوش ہوجائیں۔ اگر انھوں نے پھر اسلام اختیار کرلیا تو اسلامی زندگی کی برکات وسعادتیں پھر ان کے شامل حال ہوں گی۔ غور کیجئے! اگر مرتد کی سزا قتل ہوتی تو ان لوگوں کے پھر اسلام میں آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اس سے اگلی آیات میں ان لوگوں کے طبعی موت سے مرجانے کا ذکر ہے۔ ارشاد ہے:

ان الذین کفروا بعد ایمانھم ثم ازدادوا کفرا لن یقبل توبتھم واولئك ھم الضالون ٭ ان الذین کفروا وماتوا وھم کفار فلن یقبل من احدھم ملء الارض ذھبا ولوافتدی بہ۔ اولئك لھم عذاب الیم ومالھم من نٰصرین (۳: ۹۰-۸۹)

جن لوگوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کرلیا، اور پھر اپنے کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے تو ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ یہی لوگ ہیں جو راہ راست سے بھٹک گئے۔

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور مرتے دم تک کفر پر جمے رہے، تو اگر ان میں سے کوئی شخص پورا کرہ ارض سونے سے بھر کر دیدے جب بھی اس کے فدیے میں قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہ لوگ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہوگا اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

غور کیجئے۔ قرآن کہتا ہے کہ جن لوگوں نے اسلام لانے کے بعد پھر سے کفر کی راہ اختیار کرلی (مرتد ہوگئے) اور پھر اسی حالت کفر میں مرگئے

---

[1] مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن حال ہی میں شائع ہوئی ہے (جو سورۂ انعام تک ہے) اس میں سورۂ آل عمران کی ان آیات کی تفسیر میں مودودی صاحب نے کہیں نہیں لکھا کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔

(وماتوا وھم کفار) تو ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ دیکھئے! یہاں ان کے طبعی موت سے مرجانے کا ذکر صاف طور پر موجود ہے۔ اگر مرتد کی سزا قتل ہوتی تو نہ ان کے کفر میں بڑھتے جانے کا ذکر ہوتا (کیونکہ جسے قتل کر دیا جائے وہ کفر میں بڑھتا کیسے جائے گا! کفر میں اضافہ تو اسی وقت ہوگا جب مرتد ہونے کے بعد جیتا رہے) اور نہ ہی یہ لکھا ہوتا کہ وہ بحالتِ کفر مرجائیں گے۔ (ماتوا)۔ مودودی صاحب نے اپنے رسالے میں ان آیات کا ذکر تک نہیں کیا۔ (نہ ہی تفہیم القرآن میں ان آیات کے ضمن میں قتلِ مرتد کا سوال اٹھایا ہے۔)

اب اور آگے بڑھئے۔ سورۂ نساء میں ہے:

ان الذین اٰمنوا ثم کفروا۔ ثم اٰمنوا ثم کفروا۔ ثم ازدادوا کفراً لم یکن اللہ لیغفرلھم ولا لیھدیھم سبیلاً (۴/۱۳۷)

جو لوگ ایمان لائے۔ اس کے بعد پھر کافر ہوگئے۔ پھر ایمان لائے۔ پھر کافر ہوگئے۔ اور پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے۔ تو یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ انہیں بخشنے والا نہیں۔ اور ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ انہیں ہدایت کی راہ دکھائے۔

یعنی یہاں صرف ایک مرتبہ مرتد ہوجانے کا ذکر نہیں، دوبار ارتداد کا ذکر ہے۔ اسلام لائے۔ پھر مرتد ہوگئے۔ پھر اسلام لائے پھر مرتد ہوگئے۔[1] اور اس کے بعد اسلام نہیں لائے بلکہ حالتِ کفر میں بڑھتے چلے گئے۔ ان کی بخشش نہیں ہوگی۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کی رُو سے اسلام اور کفر کے دروازے کس طرح آمد و رفت کیلئے کھلے رہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے اور اسی کے خلاف مودودی صاحب کا فرمان ہے کہ

جسے آکر واپس جانا ہوا سے ہم پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمد و رفت کے لئے کھلا ہوا نہیں۔ لہٰذا اگر آتے ہو تو یہ فیصلہ کر کے آؤ کہ واپس نہیں جانا ہے ورنہ براہ کرم آؤ ہی نہیں۔

اسلام سے "واپس جانے والا" کہتا ہے کہ دیکھو! خدا نے یہ دروازہ کھلا رکھا ہے اس لئے میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ (معاذ اللہ) خدا کون ہوتا ہے جو اس دروازے کو کھلا رکھ سکے۔ ان دروازوں کو روایات نے بند کیا ہے۔ فقہ نے بند کیا ہے۔ اور اب ان پر ہمارا پہرہ ہے۔ خدا نے کھولا تھا لیکن ہم انہیں بند کرتے ہیں۔ اب دیکھیں خدا انہیں کس طرح کھول سکتا ہے۔

ایک آیت اور دیکھئے جس میں "ارتداد" کا خصوصی ذکر ہے۔ فرمایا:

یا یھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ۔ ۔ ۔ الخ (۵/۵۴)

اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی مرتد ہوجائے[2] تو (ایسے لوگوں کی جگہ) خدا ایک ایسی قوم پیدا کر دے گا جنہیں خدا دوست رکھے گا اور وہ خدا کو دوست رکھنے والے ہوں گے۔ مومنوں کے مقابلے میں نہایت نرم اور جھکے ہوئے لیکن دشمنوں کے مقابلے میں نہایت سخت۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنے والے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ چاہے عطا کر دے۔ اللہ اپنے فضل میں بڑی وسعت والا، علم والا ہے۔

---

[1] مودودی صاحب تفہیم القرآن میں اس آیت کو بھی گول کر گئے ہیں۔

[2] مودودی صاحب نے تفہیم القرآن میں اس آیت کے تحت بھی یہ نہیں لکھا کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ وہاں بھی چپکے سے آگے بڑھ گئے ہیں۔

دیکھیے بات کس قدر صاف ہے! اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ جو کوئی مرتد ہوتا ہے تو اسے جانے دو۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایسے لوگوں کی جگہ ہم ایسی قوم لے آئیں گے جو صحیح مومنانہ صفات کے پیکر ہوں گے۔ اس آیت میں بھی کہیں یہ نہیں لکھا کہ ان لوگوں کو قتل کردو۔ قتل کرنا تو ایک طرف رسول اللہ سے تو یہاں تک فرما دیا کہ اگر یہ ایسا کرتے ہیں تو کرنے دو۔ تمہیں ان پر پاسبان بنا کر تھوڑا بھیجا گیا ہے۔ ومن تولی فما ارسلنٰك علیھم حفیظاً (۴/۸۰) "جو کوئی اطاعت سے پھر جائے تو اے رسول! ہم نے تمہیں ان پر پاسبان بنا کر نہیں بھیجا۔"

اب سورۂ نحل کی ان آیات کو دیکھئے جن کا ایک حصہ پہلے بھی درج کیا جا چکا ہے۔ ارشاد ہے:

من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرا فعلیھم غضب من اللہ ولھم عذاب عظیم (۱۶/۱۰۶)

جو شخص ایمان لانے کے بعد پھر اللہ سے کفر کرتا ہے۔ وہ نہیں جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو بلکہ وہ جس کا سینہ کفر پر کھل جائے۔ تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

یہاں صراحت سے مرتد کا ذکر ہے اور ایسے مرتد کا جو جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ اپنے دل کی کشادگی سے کفر اختیار کرتا ہے۔ قرآن نے کہیں نہیں لکھا کہ اس کی سزا موت ہے۔ اسے تیغ کے گھاٹ اتار دو۔ اس سے اگلی آیت میں اس کی وجہ بیان کی ہے۔ فرمایا،

ذالك بانھم استحبوا الحیوٰۃ الدنیا علی الاخرۃ وان اللہ لا یھدی القوم الکافرین (۱۶/۱۰۷)

یہ اس لئے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور اللہ کافروں کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا۔

یہ تھی وہ وجہ جس سے انھوں نے اسلام چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار کی۔ انھوں نے مستقبل کی کامرانیوں کی بجائے پیش پا افتادہ مفاد کے حصول کو ترجیح دی۔ اور یہ اسلئے کیا کہ ان میں دور اندیشی اور عاقبت بینی کا مادہ نہیں رہا۔

اولئك الذین طبع اللہ علی قلوبھم وسمعھم وابصارھم واولئك ھم الغافلون (۱۶/۱۰۸)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر مہر لگا دی اور یہ لوگ غفلت میں ڈوب گئے۔

ان کی اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا؟

لاجرم انھم فی الاخرۃ ھم الخاسرون (۱۶/۱۰۹)

لامحالہ یہی لوگ ہیں جو آخرت میں تباہ حال ہوں گے۔

غور کیجئے۔ قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردن مار دی جائے گی اور اس طرح انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اسلام لا کر پھر کفر اختیار کرنے کی سزا کیا ہے؟ قرآن کا فیصلہ واضح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شروع میں بھی اسلام سے

قرآن کا واضح فیصلہ

انکار وہی لوگ کرتے ہیں جن میں صحیح بصیرت نہیں ہوتی۔ ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون۔ ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب عظیم (۲/۶-۷)

"وہ لوگ جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، تم انھیں (ان کی اس روش کے نتائج سے) آگاہ کرو یا نہ کرو۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کے دلوں اور کانوں پر اللہ نے مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا۔ ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔" اسی طرح وہ لوگ جنھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی حالت ایسی ہی کرلی ان کا بھی یہی حشر ہوگا (ولہم عذاب عظیم ۔ ۲/۷) آپ نے دیکھا کہ اس باب میں قرآن نے شروع میں اسلام سے انکار کرنے والوں اور اسلام لاکر اس سے پھر جانے والوں میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ کہتا ہے کہ دونوں کے انکار کی علت ایک ہی ہے۔ یعنی طبع اللہ علیٰ قلوبھم ۔ ۔ ۔ ۔ ان لوگوں نے اپنی عقل و بصیرت کھودی ہے اور اسلام کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ اس لئے عقل ودانش کو مفلوج کرکے نہ تو پہلی بار اسلام قبول کرایا جاسکتا ہے نہ ہی ان لوگوں کو اسلام میں بالجبر رکھا جاسکتا ہے جو عقل ودانش سے یکسر محروم ہوچکے ہوں۔ اور اس طرح انھوں نے اسلام چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہو۔ وہ کہتا ہے کہ جب علت دونوں کی ایک ہے تو پھر ان دونوں سے سلوک میں فرق کیسا؟ لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں اللہ میاں کو (معاذ اللہ) اس کا پتہ نہیں۔ ان میں بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے اول الذکر گروہ کو تو جینے کا حق دیا جاسکتا ہے لیکن ثانی الذکر کو یہ حق قطعاً نہیں دیا جاسکتا۔ اسے گولی ماردینی چاہئے!

بہرحال یہ ہیں قرآن کی وہ آیات جن کا ذکر تک مودودی صاحب نے اپنے مقالہ میں نہیں کیا اور جن سے یہ واضح ہے کہ قرآن کی روسے ارتداد کوئی جرم نہیں۔ اب پھر مودودی صاحب کی اس دلیل پر غور کیجئے جس میں وہ کہتے ہیں کہ اگر قرآن میں جرم ارتداد کی سزا نہیں لکھی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کی سزا ہی مقرر نہ کی جائے۔ اس کی سزا روایات اور فقہ نے متعین کردی ہے۔ لیکن جو آیات اوپر لکھی جاچکی ہیں ان سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ مرتد کے معاملے میں قرآن نے واضح الفاظ میں بتادیا ہے کہ اسلام کے بعد کفر اختیار کرلینا کوئی جرم نہیں۔ ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ مسلمان رہے یا اسلام چھوڑ کر کفر اختیار کرلے۔ اس لئے جب یہ چیز جرم ہی نہیں تو اس کی سزا کیسی؟ بنابریں بات یوں ٹھہری کہ

ارتداد جرم ہی نہیں لہذا سزا کیسی؟

(۱) قرآن نہ تو ارتداد کو جرم قرار دیتا ہے اور (اس لئے) نہ اس کی کوئی سزا تجویز کرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ کہتا ہے کہ جس کا جی چاہے اسلام چھوڑ کر کفر اختیار کرلے۔

لیکن (۲) اس کے برعکس، احادیث اور فقہ ارتداد کو جرم قرار دیتی ہیں اور اس کی سزا موت بتاتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں کس کا فیصلہ صحیح ماننا چاہئے۔

(الف) مُلا (اور اس گروہ کے ترجمان مودودی صاحب) کا فتویٰ ہے کہ حکم روایات اور فقہ کا مانا جائے۔ اور

(ب) ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ فیصلہ قرآن ہی کا فیصلہ ہے اور حکم اللہ ہی کا حکم ہے۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون۔ (جو قرآن کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں کافر ہے)۔

باقی رہا روایات کا اور فقہ کا معاملہ سو

(ج) ہمارے نزدیک نہ رسول اللہؐ کوئی ایسا حکم دے سکتے تھے جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہو اور نہ ہی ائمہ فقہ کے

متعلق ایسا خیال کرتے ہیں اس لئے یہ چیزیں وضعی اور بعد کی اختراع ہیں۔ انھیں رسول اللہ یا ائمہ فقہ کی طرف منسوب کرنا بڑی جرأت اور گستاخی ہے۔

تواتر کی سند

لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں:

اگر ایسے امور بھی مشکوک ہو جائیں جن کے لئے اس قدر تسلسل اور تواتر کے ساتھ شہادتیں پائی جاتی ہیں تو معاملہ ایک دو مسائل تک محدود کہاں رہتا ہے۔ اس کے بعد تو زمانہ گزشتہ کی کوئی چیز بھی جو ہم تک روایۃً پہنچی ہے شک سے محفوظ نہیں رہتی۔ (ص۴۰)

اس کے متعلق ہماری گذارش یہ ہے کہ معاملہ ایک دو مسائل تک جائے یا ہزار دو ہزار تک، اصول ہر جگہ ایک ہی ہونا چاہیئے یعنی جو بات قرآن کے خلاف ہے اسے ایک لمحہ کے لئے بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ ہم تک صرف قرآن محفوظ پہنچا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز کی حفاظت کا ذمہ اس نے نہیں لیا۔ اگر ہمارے پاس قرآن محفوظ شکل میں نہ ہوتا تو ہمیں بھی مجبوراً "تسلسل اور تواتر" کا محتاج ہونا پڑتا جس طرح دنیا کے دیگر اہل کتاب کے ساتھ ہوا ہے۔ لیکن جب ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی محفوظ شکل میں موجود ہے تو تسلسل اور تواتر کا معیار اللہ کی کتاب ہوگی نہ کہ اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال کر، ہمارا عمل تسلسل اور تواتر پر ہوگا، اگر دین کے لئے تسلسل اور تواتر ہی کو معیار بنانا تھا تو قرآن کو محفوظ رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ بہر حال یہ ہیں دو مسلک جو بالکل کھلے اور واضح ہیں۔ قرآن کو چھوڑ کر تسلسل اور تواتر کو دین ماننے کا مسلک مودودی صاحب (اور تمام مولویوں) کا مسلک ہے۔ اور تسلسل اور تواتر کو کتاب اللہ کے تابع رکھنے کا مسلک ہمارا مسلک ہے۔

مودودی صاحب کے نزدیک ان کا مسلک عین اسلام کا مسلک ہے اور ہمارا مسلک کفر کا مسلک! اور چونکہ مسلمان ہونے کے بعد "کفر کا مسلک" ارتداد ہے اور مرتد کی سزا قتل ہے اس لئے ہماری سزا موت ہے۔

احادیث اور قتلِ مرتد

قرآن کی اس "دلیل" کے بعد مودودی صاحب نے احادیث کی رو سے قتلِ مرتد کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس باب میں ہمیں کسی بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ قرآن کے ایسے واضح احکام کے بعد کوئی چیز جو قرآن کے خلاف جاتی ہو اس قابل نہیں ہو سکتی کہ اسے درخور اعتنا سمجھا جائے۔ یوں بھی روایات سے کیا کچھ ثابت نہیں کیا جا سکتا! جس مقصد کے لئے ہم نے اس حصے کا ضمنی ذکر چھیڑا ہے وہ کچھ اور ہے۔ عام طور پر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ اس چیز کی کوئی بین مثال پیش کرنی چاہیئے کہ روایات میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو قرآن کی تعلیم کے صریح خلاف جاتی ہیں۔ اس کی مثال مودودی صاحب کی پیش کردہ احادیث سے مل سکے گی۔ ان احادیث میں مذکور ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

کسی مسلمان کا خون حلال نہیں الا یہ کہ اس نے شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کی ہو۔ یا مسلمان ہونے کے بعد کفر اختیار کیا ہو۔ یا کسی کی جان لی ہو۔ (ص۴۳)

اس حدیث میں تین باتوں میں سے دو باتیں ایسی ہیں جو قرآن کے احکام کے یکسر خلاف ہیں۔ ایک تو قتلِ مرتد جس کے متعلق قرآنی آیات سابقہ صفحات میں آپ کی نظر سے گذر چکی ہیں۔ دوسرے زانی کا قتل (رجم یا سنگسار) قرآن نے زانی مرد اور زانیہ عورت کی سزا سو سو دُرّے مقرر کی ہے۔ بالکل واضح اور صریح الفاظ ہیں۔ اس میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کا کوئی فرق نہیں لیکن روایات میں شادی شدہ زانی کی سزا رجم (سنگسار) لکھی ہے۔ یعنی قرآن کچھ سزا مقرر کرتا ہے اور روایات اس کے بالکل برعکس دوسری سزا بتاتی ہیں۔ جب یہ اعتراض سامنے آیا کہ روایات کی یہ سزا قرآن کے صریحاً خلاف ہے تو اس الزام سے بچنے کے لئے اور روایات وضع کر لی گئیں جن میں یہ لکھ دیا گیا کہ (معاذ اللہ) حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں قرآن میں آیۂ رجم موجود تھی اور ہم اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اب قرآن میں وہ آیت موجود نہیں لیکن اس کا حکم بدستور موجود ہے[1]۔ یعنی ایک جھوٹ کو سچا ثابت کرنے کے لئے دس جھوٹ اور وضع کئے گئے اور اس میں اتنا بھی خیال نہ رہا (یا شاید دانستہ ایسا کیا گیا) کہ اس سے حفاظتِ قرآن کا دعویٰ ہی یکسر باطل ہو جاتا ہے جس پر اسلام کا دارومدار ہے۔ لیکن مُلا کو اس سے کیا غرض کہ قرآن کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے! اس کا دین روایات پرستی ہے۔ وہ پرستش ہی اشخاص کی کرتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے معبودوں کی سلامتی چاہتا ہے خواہ اس میں خُدا باقی رہے یا نہ رہے۔

ایک دلچسپ حدیث احادیث کے ضمن میں مودودی صاحب نے ایک ایسی دلچسپ روایت نقل کی ہے جسے درج کئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ عبداللہ بن ابی سرح کسی زمانے میں رسول اللہؐ کا کاتب تھا۔ پھر شیطان نے اسے بہلا دیا اور وہ کفار سے جا ملا۔ اس کی بابت حدیث میں ہے:

> جب مکہ فتح ہوا تو عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے عثمان بن عفانؓ کے دامن میں پناہ لی۔ عثمانؓ اس کو لیکر نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ اس کی بیعت قبول فرمایئے۔ حضورؐ نے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا اور چپ رہے۔ تین دفعہ یہی ہوا۔ آپ اس کی طرف بس دیکھ دیکھ کر رہ جاتے تھے۔ آخر تین دفعہ کے بعد آپ نے اس کو بیعت میں لے لیا۔ پھر آپ صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تمہارے اندر کوئی ایسا بھلا آدمی موجود نہ تھا کہ جب اس نے دیکھا کہ میں نے بیعت سے ہاتھ روک رکھا ہے تو آگے بڑھتا اور اس شخص کو قتل کر دیتا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ آپ نے آنکھ سے اشارہ کیوں نہ فرما دیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ ایک نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ آنکھوں کی چوری کرے۔ (صفحہ ۱۷-۱۹)

آپ نے غور فرمایا کہ دربارِ رسالتمآب کا یہ کس قسم کا نقشہ کھینچا گیا ہے؟ ایک شخص مجرم ہے اور رسول اللہؐ کے نزدیک واجب القتل۔ حضرت عثمانؓ اس کی سفارش فرماتے ہیں۔ رسول اللہؐ میں (معاذ اللہ معاذ اللہ) اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ یا اسے علانیہ معاف کر دیں اور یا قتل کا حکم دیدیں۔ ہر بار نگاہ اٹھاتے ہیں اور خاموش رہ جاتے ہیں۔ پھر مجبوراً معاف کر دیتے ہیں اور پھر صحابہ کو ملامت کرتے

---

[1] طلوعِ اسلام میں اس موضوع پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔

ہیں کہ کیا ان میں "کوئی ایک بھی بھلا آدمی ایسا نہ تھا" جو رسول اللہؐ کے اس خفیہ اشارہ (یعنی خاموشی) کو بھانپ کر اس مجرم کو قتل کر دیتا!

صدمہ اس کا نہیں کہ عجم کے منافقین نے روایات سازی سے نبی اکرمؐ کی سیرت کو کس طرح مسخ کر دیا۔ صدمہ اس کا ہے کہ آج ہمارا مُلّا کس طمطراق سے ان روایات کو "دین" بنا کر پیش کئے جا رہا ہے۔ اگر وہ دانستہ ایسا کرتا ہے تو وہ خود اس سازش میں شریک ہے۔ اور اگر نادانستہ ایسا کرتا ہے تو اس کی جہالت پر جسقدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ لیکن منافقت ہو یا جہالت، نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ دنیا انہی باتوں کو مستند قرار دیکر اچھال رہی ہے اور اسلام کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔

آثارِ صحابہؓ روایات کے بعد مودودی صاحب نے آثار صحابہؓ سے بھی بعض مثالیں قتل مرتد کی تائید میں پیش کی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک گروہ مسلمان ہو کر پھر عیسائی ہو گیا اس پر

حضرت علیؓ کے حکم سے یہ لوگ قتل کر دیئے گئے اور ان کے بال بچے غلام بنائے گئے (ص۲۱)

مذہب بدلنے والوں کو قتل کر دیا اور اس کے بال بچوں کو غلام بنا لیا! یہ ہے اسلام؟

اور آگے بڑھیئے۔ لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کو اطلاع دی گئی کہ کچھ لوگ آپ کو رب قرار دے رہے ہیں۔ حضرت علیؓ نے انھیں سمجھایا لیکن وہ اپنے اس عقیدے سے باز نہ آئے۔

آخر کار حضرت علیؓ نے ایک گڑھا کھدوایا۔ اس میں آگ جلوائی۔ پھر ان سے کہا، دیکھو اب بھی اپنے قول سے باز آ جاؤ۔ ورنہ تمہیں اس گڑھے میں پھینک دوں گا۔ مگر وہ اپنے اسی عقیدے پر قائم رہے۔ تب حضرت علیؓ کے حکم سے وہ سب اسی گڑھے میں پھینک دیئے گئے۔ (ص۲۲)

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک گھر کے لوگوں نے اپنے ہاں ایک بت بنا رکھا تھا اور اس کی پرستش کرتے تھے۔

یہ سن کر حضرت علیؓ خود وہاں تشریف لے گئے۔ تلاشی لینے پر بت نکل آیا۔ حضرت علیؓ نے اس گھر میں آگ لگا دی اور وہ گھر والوں سمیت جل گیا۔ (ص۲۲)

یہ ہیں آپ کی "خلافتِ راشدہ" کے وہ کارنامے جو عجمی سازش کے صدقے آپ کی کتب روایات میں درج ہو چکے ہیں اور جنھیں آج مزاج شناسِ اسلام، سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، اس فخر سے بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں اور ان سے ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ خدا اسلام کو ایسے دوستوں سے بچائے!

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو تبلیغ کا حق؟ اس کے بعد مودودی صاحب نے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ کیا ایک صحیح اسلامی حکومت کے تحت غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق

اسی طرح حاصل ہوگا جس طرح مسلمانوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

اس کے جواب میں آپ ارشاد فرماتے ہیں:

> اس مسئلہ کا فیصلہ بڑی حد تک تو قتل مرتد کے قانون نے خود ہی کر دیا ہے۔ کیونکہ جب ہم اپنے حدود اقتدار میں کسی ایسے شخص کو جو مسلمان ہو اسلام سے نکل کر کوئی دوسرا مذہب و مسلک قبول کرنے کا حق نہیں دیتے تو لامحالہ اس کے یہی معنی ہیں کہ ہم حدودِ اسلام میں اسلام کے بالمقابل کسی دوسری دعوت کے اٹھنے اور پھیلنے کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ دوسرے مذاہب و مسالک کو تبلیغ کا حق دینا اور مسلمانوں کے لئے تبدیل مذہب کو جرم ٹھہرانا، دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور موخر الذکر قانون مقدم الذکر چیز کو خود بخود کالعدم کر دیتا ہے۔ لہٰذا قتل مرتد کا قانون فی نفسہ یہ نتیجہ نکالنے کے لئے کافی ہے کہ اسلام اپنے حدود اقتدار میں تبلیغ کفر کا روادار نہیں۔ (ص ۳۲-۳۳)

چونکہ یہ مسئلہ بہت اہم تھا کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق دیا جائے گا یا نہیں۔ اس لئے آپ نے اس سوال کے جواب میں تفصیلی بحث کی ہے اور اس بحث سے وہی کچھ ثابت کیا ہے جو اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ بحث کے اخیر پر آپ پھر لکھتے ہیں کہ

> اس میں بھی کہیں کوئی اشارہ تک ہمیں ایسا نہیں ملتا کہ اسلامی حکومت کسی ایسے شخص کو اگر اپنے حدود میں کام کرنے کی اجازت دے سکتی ہے جو کسی دوسرے مذہب و مسلک کا پرچار کرنا چاہتا ہو۔ اب اگر بعد کے (یعنی خلافت راشدہ کے بعد کے) دنیا پرست "خلفاء" اور بادشاہوں نے اس کے خلاف کوئی عمل کیا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اسلام کا قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔ بلکہ وہ دراصل اس کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ ایک حقیقی اسلامی حکومت کے فرائض سے ناواقف تھے، یا ان سے منحرف ہو چکے تھے . . . . . . اسلامی نقطۂ نظر سے یہ سب کارنامے ان بادشاہوں کے جرائم کی فہرست میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ (ص ۴۰-۴۱)

اقتباسات بالا میں آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کے نزدیک:

(i) اسلام اپنے حدود اقتدار میں کفر کی تبلیغ کا روادار نہیں۔

(ii) اسلامی حکومت کسی ایسے شخص کو اپنے حدود میں کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی جو کسی دوسرے مذہب و مسلک کا پرچار کرنا چاہتا ہو۔

(iii) اگر کسی نے غیر مسلموں کو اسلامی حکومت میں اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت دی ہے تو اس کا یہ فعل اسلام کے خلاف تھا اور اسلام کی عدالت میں جرم۔

ایک ملتی جلتی بات

آپ کو شاید معلوم ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک یہ بھی اسلام کا حکم ہے (اور "اسلامی حکومت" کا فریضہ) کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام بنایا جائے اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر بے حد و بے شمار (جتنی جی چاہیں) گھروں میں ڈال لیا جائے۔ اس پر کسی نے یہ اعتراض کیا کہ اگر یہی روش دوسری قومیں بھی اختیار کر لیں اور مسلمانوں کی

بہو، بیٹیوں، ماؤں، بہنوں کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک ہونے لگے تو آپ پر کیا گزرے گی؟ لیکن "اسلامی جماعت" اور اس کے امیر کو ــــ کیا غرض کہ وہ سوچیں کہ مسلمانوں کی عزت و آبرو اور عصمت و ناموس سے کیا بنتی ہے؟ اگلے دنوں (کسی بازار کے سلسلے میں) ایک سکھ ہندوستان سے پاکستان آیا تھا۔ اغوا شدہ عورتوں کے سلسلے میں اس کے ایک جاننے والے مسلمان نے اس سے بات چیت کی اور کہا کہ کیا تم لوگوں کو اس کا ذرا خیال نہیں آتا کہ دوسروں کی عورتوں کو اس طرح گھروں میں ڈال لینا شریفوں کا کام نہیں! سکھ نے کہا کہ ہم تو اس فعل کو شروع ہی سے خلاف انسانیت سمجھتے تھے لیکن مسلمانوں نے یہ بتا کر کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنانا عین اسلام ہے، ہمیں بھی اس کی جرأت دلا دی۔ اگر یہ فعل عین اسلام کے مطابق ہے تو ہمیں ایک اسلامی کام سے کیوں روکا جاتا ہے؟

اسی قسم کا یہ دوسرا فتویٰ بارگاہ امارت مآب سے صادر ہوا ہے کہ اسلامی مملکت میں کسی غیر مسلم کو اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت نہیں ہوگی۔ جب یہی قانون دوسری سلطنتیں اپنے ہاں رائج کر لیں گی تو پھر مسلمان چیخیں گے!

بہرحال، اب قتل مرتد کے سلسلے میں آگے بڑھئے۔

قتلِ مرتد کی عقلی دلیلیں ان نقلی شہادات کے بعد مودودی صاحب نے "قتل مرتد پر عقلی بحث" کی ہے۔ یہ حصہ مقالہ کے پہلے حصے سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ اسلئے کہ ــ "ملا اور عقلی بحث" ــــ نتیجہ ظاہر ہے۔ مودودی صاحب نے سب سے پہلے ان اعتراضات کو خود ہی نقل کر دیا ہے جو ان کے نزدیک قتل مرتد کے خلاف عقلاً وارد ہو سکتے ہیں۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں کہ "قتل مرتد پر زیادہ سے زیادہ جو اعتراضات ممکن ہیں وہ یہ ہیں:-

اولاً یہ چیز آزادیٔ ضمیر کے خلاف ہے۔ ہر انسان کو یہ آزادی ہونی چاہئے کہ جس چیز پر اس کا قلب مطمئن ہو اسے قبول کرے اور جس چیز پر اس کا اطمینان نہ ہو اسے قبول نہ کرے۔ یہ آزادی جس طرح ایک مسلک کو ابتداءً قبول کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں ہر آدمی کو ملنی چاہئے اسی طرح ایک مسلک کو قبول کرنے کے بعد اس پر قائم رہنے یا نہ رہنے کے معاملے میں بھی حاصل ہونی چاہئے . . . .

ثانیاً۔ جو رائے اس طرح جبراً بدل جائے یا جس رائے پر سزائے موت کے خوف سے لوگ قائم رہیں تو وہ بہرحال ایماندارانہ رائے تو نہیں ہو سکتی۔ اس کی حیثیت محض ایک منافقانہ اظہار رائے کی ہوگی۔ . . . . جو شخص ارتداد کا فیصلہ کر چکا ہو اگر سزائے موت سے بچنے کے لئے منافقانہ طریقے سے بظاہر مسلمان بنا رہے تو اس کا فائدہ کیا ہے؟

ثالثاً۔ اگر اس قاعدے کو تسلیم کر لیا جائے کہ ایک مذہب ان تمام لوگوں کو اپنی پیروی پر مجبور کرنے کا حق رکھتا ہے جو ایک مرتبہ اس کے حلقۂ اتباع میں داخل ہو چکے ہوں اور اس کے لئے اپنے دائرے سے نکلنے والوں کو سزائے موت دینا جائز ہے تو اس سے تمام مذاہب کی تبلیغ و اشاعت کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

رابعاً۔ اس معاملے میں اسلام نے بالکل ایک متناقض رویہ اختیار کرلیا ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ دین میں جبر و اکراہ کا کوئی کام نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسری طرف وہ خود ہی اس شخص کو سزائے موت کی دھمکی دیتا ہے جو اسلام سے نکل کر کفر کی طرف جانے کا ارادہ کرے۔

اعتراضات کا جواب

ان اعتراضات کا جواب دینے سے پہلے مودودی صاحب نے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ "اسلام محض ایک مذہب نہیں ہے بلکہ ایک پورا نظام زندگی ہے"۔ "ایمان ایک ایسی رائے نہیں" جو صرف انفرادی طور پر ایک شخص اختیار کرتا ہے بلکہ یہ وہ رائے ہے جس کی بنا پر انسانوں کی ایک جماعت تمدن کے پورے نظام کو ایک خاص شکل پر قائم کرتی ہے اور اسے چلانے کے لئے وجود میں لاتی ہے"۔ مودودی صاحب کے جوابات کی ساری عمارت اسی بنیاد پر اٹھی ہے۔ یعنی اسلام ایک اسٹیٹ (state) ہے، لہذا دیکھنا یہ چاہیئے کہ ایک اسٹیٹ کا اس باب میں کیا رویہ ہونا چاہیئے۔ اس تمہید کے بعد مودودی صاحب کے جوابات ملاحظہ فرمائیے۔

پہلا اعتراض یہ تھا کہ یہ بات آزادیٔ ضمیر کے خلاف ہے کہ جس بات پر کسی شخص کا قلب مطمئن نہ ہو اسے اس کے تسلیم کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں ؛

> مرتد کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنے ارتداد سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تنظیم جس بنیاد پر رکھی گئی ہے اس کو وہ نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کرتا بلکہ اس سے کبھی آئندہ بھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ اسے قبول کرے گا۔ ایسے شخص کے لئے مناسب یہ ہے کہ جب وہ اپنے لئے اس بنیاد کو ناقابل قبول پاتا ہے جس پر سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تعمیر ہوئی ہے تو خود اس کے حدود سے نکل جائے۔ مگر جب وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے لئے دو ہی علاج ممکن ہیں۔ یا تو اسے اسٹیٹ میں تمام حقوق شہریت سے محروم کرکے زندہ رہنے دیا جائے یا پھر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ پہلی صورت فی الواقعہ دوسری صورت سے شدید تر سزا ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لا یموت فیھا ولا یحییٰ کی حالت میں مبتلا رہے۔ وہ اس حالت میں سوسائٹی کیلئے اور بھی خطرناک ہو جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے موت کی سزا دے کر اس کی سوسائٹی کی مصیبت کا بیک وقت خاتمہ کر دیا جائے۔ (ص۵۱)

اس جواب کا تجزیہ

اس دلیل کا ذرا تجزیہ کرکے دیکھئے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جس شخص کے نزدیک وہ بنیاد قابل قبول نہیں جس پر اسلامی اسٹیٹ اور سوسائٹی کی عمارت استوار ہوتی ہے، اس کے لئے صرف تین صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔

---

[1] حرفاً حرفاً وہی بات جو کفار اپنے رسولوں سے کہتے تھے کہ لنخرجنکم من ارضنا او لتعودن فی ملتنا۔ یا پھر سے ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ۔ یا ملک چھوڑ کر چلے جاؤ۔ قرآن اس روش کو کفار کی روش بتاتا ہے اور مودودی صاحب اسے عین اسلام قرار دیتے ہیں!

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد

(i) یا تو وہ اسلامی مملکت کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔
(ii) اسلامی مملکت میں رکھا جائے تو تمام حقوق شہریت سے محروم کر کے زندہ رہنے دیا جائے۔ یا
(iii) قتل کر دیا جائے۔

اس کے بعد مودودی صاحب شق (i) اور (ii) میں خود ہی موازنہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ چونکہ حقوق شہریت سے محروم کر کے زندہ رکھنے کا عذاب زیادہ شدید ہے اس لئے "تقاضائے ہمدردی" یہی ہے کہ اسے مار دیا جائے۔ تپ دق سے پھانسی ہزار درجے اچھی۔

پسِ سسک کے مرنا غمِ ہجر میں بلا ہے ——— کوئی ظلم مجھ پہ ہوتا مگر ایک بار ہوتا

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک یہ صورت ممکن ہی نہیں کہ جو شخص اسلامی سوسائٹی کی بنیادوں پر یقین نہیں رکھتا اسے اسلامی مملکت میں حقوقِ شہریت دیکر زندہ رہنے کی اجازت دی جائے۔ اسے یا تو مملکت چھوڑ جانا ہوگا یا تلوار کے گھاٹ اتر جانا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے لئے۔ یعنی ان کے لئے جو ان بنیادوں کو نہیں مانتے جن پر اسلامی سوسائٹی تشکیل ہوتی ہے (بالفاظ دیگر جو ایمان نہیں رکھتے) ایسی صورت ممکن ہی نہیں کہ انھیں حقوق شہریت دیکر زندہ رہنے دیا جائے؟ اسلامی

ذمیوں کے حقوق

تصور مملکت میں ایک لفظ ذمّی بھی ہے۔ ذمّی وہ غیر مسلم ہیں جو اسلامی مملکت میں غیر مسلموں ہی کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ ان کے متعلق مودودی صاحب اسی مقالہ میں فرماتے ہیں:

> اس معاملے میں (ذمیوں کے معاملے میں) اسلام نے جتنی رواداری برتی ہے دنیا کی تاریخ میں کبھی کسی دوسرے نظام نے نہیں برتی۔ دوسرے جتنے نظام ہیں وہ اساسی اختلاف رکھنے والوں کو یا تو زبردستی اپنے اصولوں کا پابند بناتے ہیں یا انھیں بالکل فنا کر دیتے ہیں۔ وہ صرف اسلام ہی ہے جو ایسے لوگوں کو ذمّی بنا کر اور انھیں زیادہ سے زیادہ ممکن آزادیٔ عمل دیکر اپنے حدود میں جگہ دیتا ہے اور ان کے بہت سے ایسے اعمال کو برداشت کرتا ہے جو براہِ راست اسلامی سوسائٹی اور اسٹیٹ کی اساس سے متصادم ہوتے ہیں۔ (ص ۴۹)

آپ یقیناً تعجب سے پوچھیں گے کہ جب خود مودودی صاحب کے نزدیک اسلامی مملکت میں ایسے لوگوں کے لئے گنجائش موجود ہے جو اس کے اساسی تصورات کو قبول نہیں کرتے۔ تو جو مسلمان اسلام چھوڑتا ہے اس کی بھی تو یہی حیثیت ہے کہ وہ اسلام کے اساسی تصورات کو ناقابلِ قبول سمجھتا ہے۔ پھر ایسے شخص کے لئے اسلامی مملکت میں گنجائش کیوں نہیں؟

کافر اور مرتد کا فرق

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جو شخص شروع ہی سے کافر ہے اس میں اور جو شخص ایک دفعہ مسلمان ہونے کے بعد کفر کی طرف لوٹتا ہے، اس میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اول الذکر کے لئے اسلامی مملکت میں آزادیٔ عمل و عقیدہ سے جینے کی گنجائش ہے۔ گنجائش ہی نہیں بلکہ اس کے لئے اسلامی مملکت بڑی مراعات دیتی ہے لیکن جو مسلمان ان ذمیوں میں شامل ہونا چاہے اس کیلئے پھانسی کے تختے کے سوا کوئی اور جگہ نہیں۔ اب اس تفریق و تمیز کی وجوہات سنئے

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ

(ذمیوں کے ساتھ) اس رواداری کی وجہ یہ ہے کہ اسلام انسانی فطرت سے مایوس نہیں ہے۔ وہ خدا کے بندوں سے آخر وقت تک یہ امید وابستہ رکھتا ہے کہ جب انھیں دینِ حق کے ماتحت رہ کر اس کی نعمتوں اور برکتوں کے مشاہدہ کا موقع ملے گا تو وہ بالآخر اس حق کو قبول کر لیں گے جس کی روشنی فی الحال انھیں نظر نہیں آتی۔ اس لئے وہ صبر سے کام لیتا ہے۔ (ص۳۵)

گویا ایک ہندو کی فطرت تو انسانی فطرت ہے جس سے اسلام مایوس نہیں ہوتا لیکن اگر ایک مسلمان کسی غلط فہمی، غلط نگہی یا اور سبب سے ہندو ہو جاتا ہے تو اس سے اسلام مایوس ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی فطرت انسانی فطرت نہیں رہتی۔ کچھ اور بن جاتی ہے۔ وہ "خدا کے بندوں" سے آخر وقت تک نیک امید وابستہ رکھتا ہے۔ لیکن جب ایک مسلمان عیسائی ہو جائے تو وہ اس سے کوئی نیک امید وابستہ نہیں رکھتا کیونکہ وہ "خدا کا بندہ" نہیں رہتا! یعنی مودودی صاحب کے نزدیک جو مسلمان ایک مرتبہ مذہب تبدیل کر لے، اس میں پھر اصلاح کا امکان قطعاً نہیں رہتا اس لئے اس کا علاج قتل کے سوا کچھ اور نہیں۔ حالانکہ وہ اس روایت کو بھی خود ہی نقل کرتے ہیں کہ

عمرو بن عاص حاکم مصر نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ ایک شخص اسلام لایا تھا پھر کافر ہو گیا۔ پھر اسلام لایا پھر کافر ہو گیا۔ یہ فعل وہ کئی مرتبہ کر چکا ہے۔ اب اس کا اسلام قبول کیا جائے یا نہ۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ جب تک اللہ اس سے اسلام قبول کرتا ہے تم بھی کئے جاؤ۔ اس کے سامنے اسلام پیش کرو۔ مان لے تو چھوڑ دو۔ ورنہ گردن مار دو۔ (ص۱۵۸)

یعنی حضرت عمرؓ کا فیصلہ تو یہ تھا کہ وہ ہزار بار بھی کافر ہو جائے تو بھی اس سے مایوس نہ ہو۔ لیکن ہمارے دورِ حاضر کے امیر المومنین ہیں کہ ان کی رائے میں جو مسلمان ایک مرتبہ بھی کفر اختیار کر لے اس سے تمام امیدیں منقطع ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا اس کا علاج موت کے سوا کچھ نہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس قسم کی روش کو جس کی اجازت حضرت عمرؓ نے دی تھی، کھلنڈرے پن سے تعبیر کرتے ہیں۔ ارشاد ہے کہ

ہم ایسے لوگوں کیلئے اپنی جماعت کے اندر آنے کا دروازہ بند کر دینا چاہتے ہیں جو تلون کے مرض میں مبتلا ہیں ....
کسی نظامِ زندگی کی تعمیر ایک نہایت سنجیدہ کام ہے جو جماعت اس کام کے لئے اٹھے اس میں لہری طبیعت کے کھلنڈرے لوگوں کیلئے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ (ص۵۸)

غور کیجئے۔ اللہ تعالیٰ "ان الذین آمنوا ثم کفروا ثم آمنوا ثم کفروا" کہہ کر اس امکان کی شہادت دیتے ہیں کہ ایک شخص مرتد ہو کر پھر بھی اسلام لا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ اس کی تاکید کرتے ہیں کہ مرتد کے لئے اسلام کا دروازہ ہر بار کھلا رہنا چاہئے لیکن یہ ہمارے "مزاج شناسِ خدا و رسولؐ" ہیں کہ ان کے نزدیک یہ عمل کھلنڈرا پن ہے جس کی اجازت اسلام میں قطعاً نہیں دی جا سکتی۔

کافر اور مرتد میں تفریق کی پہلی وجہ آپ نے ملاحظہ فرمالی یعنی کافر سے خدا مایوس نہیں ہوتا اسلئے اسے جملہ حقوقِ شہریت دیکر زندہ رکھا جاتا ہے۔ لیکن جو مسلمان کفر اختیار کرے اس سے خدا مایوس ہو جاتا ہے اس لئے اس کا فوراً خاتمہ کر دینا چاہئے۔

اب اس کی دوسری وجہ سنئے۔ فرماتے ہیں

نہ ملنے والے (کافر) اور مل کر الگ ہو جانے والے (مرتد) کے درمیان انسانی فطرت لازماً فرق کرتی ہے۔ نہ ملنا، تلخی، نفرت اور

عداوت کو مستلزم نہیں ہے مگر مل کر الگ ہو جانا قریب قریب سو فیصدی حالات میں ان جذبات کو مستلزم ہے۔ (ص۱۹)

ہم پوچھتے ہیں کہ اگر مل کر الگ ہو جانے والے (مرتد) کی حالت یہی ہوتی ہے تو اس کیلئے توبہ کا دروازہ کیوں کھلا رکھا جاتا ہے؟ جب قریب قریب سو فیصدی حالات میں ایسے شخص کا سینہ تلخی، نفرت اور عداوت کے جذبات سے لبریز ہوتا ہے تو اسے پھر سے اپنے اندر شامل ہو جانے کی دعوت کیوں دی جاتی ہے؟

پہلا اعتراض یہ تھا کہ ہر انسان کو یہ آزادی ہونی چاہئے کہ جس چیز پر اس کا قلب مطمئن ہو اسے قبول کرے اور جس چیز پر اس کا اطمینان نہ ہو اسے قبول نہ کرے۔ اس میں کافر اور مرتد کی تفریق نہیں ہونی چاہئے۔ اس کا جواب آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کافر اور مرتد میں کیوں فرق کیا جانا ضروری ہے؟

دوسرے اعتراض کا جواب

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اس طرح باندھ کر (موت کی سزا کے ڈر سے) مسلمان رکھنے سے وہ شخص منافقانہ انداز زندگی بسر کرے گا جس کا کچھ فائدہ نہیں۔ اس کا جواب پہلے لکھا جا چکا ہے، لیکن مزید وضاحت کے لئے اس کا دہرا دینا ضروری ہے۔ ارشاد ہے:

> قتلِ مرتد کو یہ معنی پہنانا بھی غلط ہے کہ ہم ایک شخص کو موت کا خوف دلا کر منافقانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دراصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہم ایسے لوگوں کیلئے اپنی جماعت کے اندر آنے کا دروازہ بند کر دینا چاہتے ہیں جو تلون کے مرض میں مبتلا ہیں اور نظریات کی تبدیلی کا کھیل تفریح کے طور پر کھیلتے رہتے ہیں اور جن کی رائے اور سیرت میں وہ استحکام سرے سے موجود ہی نہیں ہے جو ایک نظام زندگی کی تعمیر کیلئے مطلوب ہوتا ہے۔ (ص۵۱)

آپ اندر آنے کا دروازہ تو نہیں بند کر رہے۔ آپ تو باہر جانے کا دروازہ بند کر رہے ہیں۔ اس دروازے کے بند کر دینے کے بعد جو لوگ موت کے ڈر سے مسلمان بن کر رہیں گے، وہ اگر منافقت کی زندگی بسر نہیں کرینگے تو اور کیا ہوگا؟ باقی رہا یہ کہ آپ اپنی جماعت کے اندر آنے کا راستہ ان لوگوں کیلئے بند کر دینا چاہتے ہیں جو تلون کے مرض میں مبتلا ہیں۔ تو جس طرح اسلام سے کفر کی طرف جانا تلون مزاجی کی نشانی ہے اسی دلیل سے کفر سے اسلام کی طرف آنا بھی تو تلون مزاجی ہے۔ آپ کی اس دلیل کے مطابق تو (معاذ اللہ معاذ اللہ) تمام صحابہؓ تلون مزاج تھے جو اپنا پہلا مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان کے برعکس یہ رائے اور سیرت کے "استحکام" کے پیکر (پناہ بخدا) ابوجہل اور ابولہب تھے جو مرتے مر گئے لیکن اپنے مذہب کو نہیں چھوڑا! حضرت! سوچئے کہ آپ کدھر جا رہے ہیں۔

تیرے نشتر کی زد شریانِ قیس ناتواں تک ہے

تیسرے اعتراض کا جواب

تیسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر اسلام اپنے حلقے سے باہر نکلنے والوں کو سزائے موت دیتا ہے تو اگر یہ اصول ہر مذہب نے اپنے ہاں تسلیم اور رائج کر لیا تو اس سے ہر مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اس کے جواب میں ارشاد ہے:

> اس اعتراض کی بنیاد بھی غلط ہے معترضین کے پیش نظر دراصل ان "مذاہب" کا اور انہی کے پرچار کا معاملہ ہے جن کی تعریف ہم ابتدا میں کر چکے ہیں۔ ایسے مذاہب کو واقعی اپنا دروازہ آنے اور جانے والوں کے لئے کھلا رکھنا چاہئے۔ وہ اگر جانے والوں کیلئے بند کرینگے تو ایک بے جا حرکت کریں گے۔ لیکن جس مذہب میں فکر و عمل پر سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تعمیر کی گئی ہو اسے کوئی آدمی جو اجتماعیات میں کچھ بھی بصیرت رکھتا ہو یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ وہ اپنی تخریب اور اپنے اجزائے تعمیر کے انتشار اور اپنی بندش وجود کی برہمی کا دروازہ خود ہی کھلا رکھے۔ (ص۵۲)

بالکل بجا! اسے یہی مشورہ دینا چاہئے کہ وہ ان تمام عناصر کو جو اس اسٹیٹ اور سوسائٹی کے بنیادی اصولوں سے منحرف ہو چکے ہوں، زبردستی، باندھ کر اور موت کا خوف دلا کر اس سوسائٹی کے اندر محبوس رکھے۔ اس سے فی الواقعہ وہ سوسائٹی بڑی محکم اور وہ اسٹیٹ بڑی پائدار رہے گی۔ جس اسٹیٹ یا سوسائٹی میں منافقین کی جسقدر کثرت ہوگی وہ سوسائٹی یا اسٹیٹ اسی قدر محکم بنیادوں پر استوار ہوگی۔ یہ سیاست و عمرانیت کا ایک ایسا واضح اور مسلّم الثبوت اصول ہے جس سے ہر تخریبی ذہن کما حقہٗ واقف ہے۔ لہذا مودودی صاحب کے اس جواب کی معقولیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ وہ خود فرماتے ہیں کہ

> بلاشبہ ہم نفاق کی مذمت کرتے ہیں اور اپنی جماعت میں ہر شخص کو صادق الایمان دیکھنا چاہتے۔ مگر جس شخص نے اپنی حماقت سے خود اس دروازے میں قدم رکھا جس کے متعلق اسے معلوم تھا کہ یہ جانے کے لئے کھلا ہوا نہیں ہے۔ وہ اگر نفاق کی حالت میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ اس کو اس حالت سے نکالنے کیلئے ہم اپنے نظام کی برہمی کا دروازہ نہیں کھول سکتے۔ (ص۵۳)

بالکل نہ کھولئے! بعض لوگوں کے نزدیک جس پنیر (cheese) میں جتنے زیادہ کیڑے ہوں اور وہ کلبلاتے دکھائی دیتے ہوں وہ اتنا ہی زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ وہ تو انتہائی بزدلی تھی جس نے کہدیا

کہ بو نسا دکی آتی ہے بند پانی میں

قسم ہے تنگ و تاریک حجروں کی کہ سڑاند جسقدر کثیف ہوتی جائے، مُلا کے دماغ کو اتنی ہی زیادہ راس آتی ہے۔

چوتھے اعتراض کا جواب

اب لیجئے چوتھا اعتراض یعنی یہ کہ ایک طرف اسلام "لا اکراہ فی الدین" کا اعلان کرتا ہے اور دوسری طرف وہ مذہب کی تبدیلی پر سزائے موت کا حکم سنا دیتا ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہے:

> رہا تناقض کا اعتراض تو اوپر کی بحث کو بغور پڑھنے کے بعد وہ بڑی حد تک خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ لا اکراہ فی الدین کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کو اپنے دین میں آنے کیلئے مجبور نہیں کرتے اور واقعی ہماری روش یہی ہے۔ مگر جسے آ کر واپس جانا ہو اسے ہم پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمد و رفت کیلئے کھلا ہوا نہیں ہے۔ . . . . . ہاں یہ اعتراض بظاہر کچھ وزن رکھتا ہے کہ اسلام جب اپنے پیروؤں کو تبدیلِ مذہب پر سزا دیتا ہے اور اسے ذہبی مذمت نہیں سمجھتا تو دوسرے مذاہب کے پیرو اگر اپنے ہم مذہبوں کو اسلام قبول کرنے پر سزا دیتے ہیں تو وہ ان کی مذمت کیوں کرتا ہے؟ لیکن ان دو رویوں میں بظاہر جو تناقض نظر آتا ہے فی الواقعہ وہ نہیں ہے۔

بلکہ اگر دونوں صورتوں میں ایک ہی رویہ اختیار کیا جاتا تو البتہ ناقص ہوتا۔ اسلام اپنے آپ کو حق کہتا ہے اور خلوص کے ساتھ حق ہی سمجھتا ہے اس لئے وہ حق کی طرف آنیوالے اور حق سے منہ موڑ کر واپس جانے والے کو مساوی مرتبہ پر ہرگز نہیں رکھ سکتا۔ (ص۵۳)

اس کے جواب میں اگر آپ یہ کہیں کہ دنیا کا ہر مذہب اپنے آپ کو حق پر کہتا ہے تو پھر ان مذاہب کو یہ حق کیوں نہیں پہنچتا کہ وہ بھی ایسی ہی روش اختیار کرلیں۔ اس کے جواب میں شاید مودودی صاحب یہ فرمادینگے کہ وہ اپنے آپ کو حق پر تو کہتے ہیں لیکن وہ "بالکل خلوص کے ساتھ" اپنے آپ کو حق پر نہیں سمجھتے۔ اس لئے اگر وہ یہی روش اختیار کرلیں تو انہیں اس کا قطعاً حق نہیں پہنچتا۔ نحن ابناء اللہ۔ ہم تو خدا کے چہیتے بیٹے ہیں۔ سوتیلے بیٹوں کو ہماری برابری کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے! ہم جنگ کے قیدیوں کو غلام اوران کی عورتوں کو لونڈیاں بناکر گھروں میں ڈال سکتے ہیں لیکن کسی دوسری قوم کو حق حاصل نہیں کہ وہ ہماری عورتوں کے ساتھ بھی یہی کچھ کرے۔ اس لئے کہ ہم تو حق پر ہیں اس لئے جو جی میں آئے کرسکتے ہیں اور لوگ حق پر تھوڑے ہیں۔ اسی طرح ہم اس شخص کو جو ہمارا مذہب چھوڑنا چاہے تہ تیغ کرسکتے ہیں لیکن دوسرے مذاہب کے لوگ قطعاً ایسا نہیں کرسکتے۔

لیجئے۔ چوتھے اعتراض کا جواب بھی مل گیا۔

تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہوگئے!

اگر اس پر بھی آپ مطمئن نہ ہوسکیں تو اس کا ایک ہی علاج ہے کہ ایک عدد فارم ممبری پُر کرکے اسلامی جماعت کے حلقے میں شامل ہوجائیے شخصیت پرستی آپ کی عقل وبصیرت کو مفلوج کردیگی۔ اس کے بعد حضرت صاحب کا ہر ارشاد وحیِ خداوندی دکھائی دیا کرے گا۔ پھر اطمینان ہی اطمینان ہے۔

پیدائشی مسلمان کا کیا ہوگا؟

مودودی صاحب اپنے جوابات میں باربار کہتے چلے آئے ہیں کہ جو شخص اسلام لانا چاہے ہم اسے پہلے ہی متنبہ کردیتے ہیں کہ اگر اس کے اندر داخل ہوئے تو پھر اس سے نکلنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر اس میں داخل ہونا ہے تو سوچ سمجھ کر داخل ہونا ہمارے اس اعلان کے بعد جو شخص "خود اپنی حماقت سے" اس مکڑی کے جالے میں پھنس جائے، اسے اس سے نکل جانے دینا بڑی ہی بے وقوفی ہے۔

اس سے فطری طور پر ایک خیال ذہن میں آتا ہے اور وہ یہ کہ ایک ہندو کو تو آپ نے متنبہ کردیا کہ

تم نے ہونا ہو تو کھا پی کے مسلماں ہونا

لیکن ایک بچہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ وہیں جوان ہوتا ہے۔ وہ پیدائشی مسلمان ہے۔ اس نے اپنی مرضی سے اسلام قبول نہیں کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر وہ بڑا ہوکر مذہب تبدیل کرنا چاہے تو اسے ایسا کرنے کی اجازت دی جائے گی یا اسے بھی حوالۂ دار و رسن کردیا جائیگا یہ سوال بڑا اہم ہے۔ لیکن مودودی صاحب نے اس کا بھی جواب دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

اس کا ایک جواب اصولی ہے اور ایک عملی۔ اصولی جواب یہ ہے کہ پیدائشی اور اختیاری پیروؤں کے درمیان احکام میں فرق نہ کیا جاسکتا ہے اور نہ کبھی کسی دین نے کبھی ان کے درمیان فرق کیا ہے۔

یہ تو تھا اصولی جواب۔ عملی جواب یہ ہے:

کہ جو اندیشہ ہمارے معترضین بیان کرتے ہیں وہ درحقیقت عملی دنیا میں کبھی رونما نہیں ہوتا۔ . . . . نئی نسلوں کی بہت بڑی اکثریت . . . . . اس نظام کے اتباع پر راضی اور اس کی وفاداری کرا اٹھتی ہے جس میں وہ پیدا ہوتی ہے۔ ان حالات میں صرف چند افراد ہی ایسے پیدا ہو سکتے ہیں جو مختلف وجوہ سے انحراف و بغاوت کا میلان لئے ہوئے اٹھیں یا بعد میں اس کا اکتساب کرلیں۔ . . . . ایسے افراد کے لئے دو دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ یا تو ریاست کے حدود سے باہر جا کر اس سے انحراف کریں . . . . یا وہ اپنی زندگی خطرے میں ڈالیں اور جان جوکھوں کا وہ کھیل کھیلیں جس کے بغیر کسی نظام کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد یہ فیصلہ صادر ہوتا ہے کہ

مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہونے والی اولاد مسلمان ہی سمجھی جائیگی اور قانون اسلام کی طرف سے ان کے لئے ارتداد کا دروازہ ہرگز نہ کھولا جائے گا۔ اگر ان میں سے کوئی اسلام سے پھر گیا تو وہ بھی اسی طرح قتل کا مستحق ہوگا جس طرح وہ شخص جس نے کفر سے اسلام کی طرف آکر پھر کفر کا راستہ اختیار کیا ہو۔ یہ تمام فقہائے اسلام کا متفق علیہ فیصلہ ہے۔ (ص ۹)

سن لیا آپ نے جواب؟ کیوں ہے کوئی جھنکارے کی شکل؟ اسلام نہ ہوا مذاق ہوا! لا اکراہ فی الدین کو شہد لگا کر چاٹا کرو۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے۔ مُلا کے نزدیک اس کی کیا قیمت ہے؟ فیصلہ وہی ہے جو "تمام فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے"۔ قرآن نے جب کہا تھا کہ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابًا من دون اللہ (یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو اپنا رب بنا لیتے ہیں) تو یہ صرف یہود و نصاریٰ کے لئے تھا۔ مسلمانوں کو کھلی چھٹی ہے کہ خدا کے کھلے کھلے فیصلوں کو چھوڑ کر فقہا کے فیصلوں کو دین بناتے چلے جائیں۔ انہیں کون پوچھنے والا ہے!

لیکن ہمیں حیرت ہے کہ مودودی صاحب یہیں کیوں رک گئے۔ ایک قدم آگے کیوں نہ بڑھے۔ ایک حدیث میں یہ بھی تو ہے کہ ہر بچہ دین فطرت (یعنی اسلام) پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے والدین اسے یہودی اور نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔ لہذا اگر کوئی بچہ ہندو کے ہاں بھی پیدا ہو تو بھی وہ مسلمان ہی ہوگا۔ یعنی دنیا کا ہر بچہ پیدائشی مسلمان ہوتا ہے لیکن غیر مسلم ماں باپ اسے بعد میں مرتد بنا دیتے ہیں۔ اور چونکہ پیدائشی مسلمان کے مرتد ہو جانے کی سزا بھی قتل ہے اس لئے دنیا کا ہر بچہ جو غیر مسلموں کے گھر میں پیدا ہو واجب القتل ہونا چاہیئے۔ اسلئے کہ اس نے اپنے پیدائشی مذہب (اسلام) کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کیا ہے۔

سبحان اللہ! کیسا حسین ہے یہ اسلام جو مودودی صاحب پیش فرما رہے ہیں!

بوجد آرد زمین و آسمان را

قوت کا استعمال یہ تو تھے اعتراضات کے جوابات۔ اس کے بعد مودودی صاحب اس مسئلہ کے ایجابی پہلو کی طرف آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ تبدیلی مذہب کو زبردستی روکنے کے لئے قوت کا استعمال کیوں ضروری ہے۔ بحث کا یہ حصہ سب سے اہم ہے۔ اسلئے کہ وہ اصل مقصد جس کے لئے یہ سارا جال بچھایا گیا ہے یہیں پہنچ کر نمایاں ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں؛

سوال صرف یہ ہے کہ جو ریاست کسی خطۂ زمین پر حاکمیت رکھتی ہو آیا وہ اپنے وجود کی حفاظت کے لئے ایسے افعال کو جرم قرار دینے کا حق رکھتی ہے یا نہیں جو اس نظام کے درہم برہم کرنے والے ہوں؟ اس پر اگر کوئی معترض ہو تو وہ بتائے کہ دنیا میں کب ریاست نے یہ حق استعمال نہیں کیا؟ آج کونسی ریاست ایسی ہے جو اس حق کو استعمال نہیں کر رہی ہے؟ اشتراکی اور فاشسٹ ریاستوں کو چھوڑیئے۔ ان جمہوری ریاستوں ہی کو لیجئے جن کی تاریخ اور جن کے نظریات سے موجودہ زمانے کی دنیا نے جمہوریت کا سبق سیکھا ہے۔ . . . کیا یہ اس حق کو استعمال نہیں کر رہی ہیں؟ (ص۳۵)

انگلستان اور امریکہ کا قانون

اس کے بعد انھوں نے بتایا ہے کہ انگلستان اور امریکہ کے قانون میں "تبدیلیٔ قومیت" کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ اسلئے یہ امر بھی قتل مرتد کے جواز (بلکہ وجوب) کی دلیل ہے۔

ہم اس حصے کے متعلق کسی تفصیلی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے۔ اس لئے کہ بفرضِ محال اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ انگلستان اور امریکہ کے قانون کی رُو سے "تبدیلیٔ قومیت" کی سزا موت ہے تو ہمارے طریقِ فکر کی رُو سے یہ چیز ایک مسلمان کیلئے دینی حجت نہیں بن سکتی۔ اگر کوئی چیز خدا کے دیئے ہوئے قانون میں موجود ہے اور وہی چیز کسی قوم نے اپنی بصیرت سے اپنے ہاں رائج کر رکھی ہے تو ہم اس چیز کو قرآن کی حقانیت کیلئے "تائید" پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی چیز خدا کے قانون کے خلاف ہے تو اسے خواہ ساری دنیا کی اقوام بطور قانون اختیار کرلیں، ایک مسلمان کے نزدیک وہ باطل ہی رہے گی، حق نہیں قرار پا جائے گی۔ اس لئے کسی ایسی بات کو بطور حجتِ دینی یا بطور دلیل و برہان پیش کرنا، مودودی صاحب ہی کو زیب دے سکتا ہے ہم اس کی جرأت نہیں کر سکتے۔ یہ مسلک انہی کا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف ان غیر مسلم اقوام کے نظام کو طاغوتی نظام بھی قرار دیا جائے اور دوسری طرف ان اقوام کے قوانین کو قرآن کے علی الرغم، بطور دلیل و حجت پیش کیا جائے۔

اس اصولی فرق کے بعد ہم اس باب میں ایک دو امور کے متعلق محض جزئی گفتگو پر اکتفا کرتے ہیں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

> کوئی شخص، خواہ پیدائشی رعایائے برطانیہ ہو یا باختیار خود برطانوی رعایا میں داخل ہوا ہو، ازروئے قانون یہ حق نہیں رکھتا کہ مملکت برطانوی کے حدود میں رہتے ہوئے کسی دوسری قومیت کو اختیار کرلے اور کسی دوسری وفاداری کا حلف اٹھائے یا جس قومیت سے وہ پہلے تعلق رکھتا تھا اس کی طرف پھر واپس چلا جائے۔ یہ حق اسے صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ برطانیہ کی حدود سے باہر ہو۔

مودودی صاحب نے اس قانون کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اور نہ ہمیں اس قسم کا کوئی قانون کہیں نظر آیا ہے۔ حدودِ مملکتِ برطانیہ میں اس قسم کی پابندی کے متعلق ہم نے تو کبھی سنا نہیں۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ جو شخص "حالتِ جنگ میں برطانوی قومیت اور کسی ایسے اسٹیٹ کی وفاداری اختیار کرلے جو بادشاہ برطانیہ سے برسرِ جنگ ہو۔ یا وہ" بادشاہ کے دشمنوں سے تعلق رکھے" یا وہ بادشاہ یا ملکہ یا ولی عہد کی موت کے درپے ہو" اس کی سزا موت ہے۔ لیکن اس کے متعلق انھوں نے خود ہی لکھ دیا ہے کہ یہ اس لئے کہ اس چیز کو "غدرِ کبیر"

(high treason)* قرار دیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بغاوت کے جرم کی سزا سے ارتداد کے جرم کی سزا کے لئے دلیل لانا "سوال از آسمان، دلیل از ریسماں" کے مرادف ہے۔ (بغاوت کے متعلق قرآن کا کیا حکم ہے۔ اس کے متعلق ذرا آگے چل کر لکھا جائے گا)۔

برطانیہ اور امریکہ سے آگے بڑھ کر، مودودی صاحب ارشاد فرماتے ہیں:

> یہ کچھ انہی دونوں سلطنتوں پر موقوف نہیں ہے بلکہ دنیا کے جس ملک کا قانون بھی آپ اٹھا کر دیکھیں گے وہاں آپ کو یہی اصول کام کرتا نظر آئے گا کہ ایک اسٹیٹ جن عناصر کے اجتماع سے تعمیر ہوتا ہے ان کو وہ منتشر ہونے سے بزور روکتا ہے اور ہر اس چیز کو طاقت سے دباتا ہے جو اس کے نظام کو درہم برہم کرنے کا رجحان رکھتی ہو۔ (ص۲۵)

آپ نے غور فرمایا کہ وہ کونسی حکومتیں ہیں جو اس اصولِ سیاست و آئینِ ریاست کا ذہنی پس منظر بن رہی ہیں! اقتباس بالا پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ان کے دل میں (TOTALITARIAN STATE) کا تصور کروٹیں لے رہا ہے۔ دل کی گہرائیوں میں نازی ازم، فاشزم، بلکہ روس کی اشتراکی آمریت چل رہی ہے اور زبان سے جمہوری حکومتوں کا نام لیا جا رہا ہے۔ دورِ حاضر کی ابلیسی **اسٹیٹ کا بُت** سیاست کا پیدا کردہ سب سے بڑا معبود، ریاست (STATE) کا تصور ہے۔ جو کچھ کبھی خدا کے لئے کہا یا کرایا جاتا تھا اب وہ سب کچھ ریاست (state) کے نام پر کیا یا جاتا ہے۔ اسٹیٹ ایک ایسی قربان گاہ ہے جس پر فرد کے خون کا ہر قطرہ بطور چڑھاوا چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس نئے مذہب میں وجود درحقیقت اسٹیٹ کا ہے، فرد کا نہیں۔ لیکن (state) ایک ایسی مجرد (abstract) شے کا نام ہے جس کی کوئی مشہود تعریف (definition) ہی نہیں ہو سکتی۔ البتہ جب آپ اسٹیٹ کا تجزیہ کریں تو وہ چھل چھلا کر نام رہ جاتا ہے، اس گروہ کا جس کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ اسٹیٹ کا بت (۱۵۹۱) جس کے متعلق مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

> یہ قاعدہ اپنی جگہ عالمگیر مقبولیت رکھتا ہے کہ ریاست اور حاکمیت کی عین فطرت اس امر کی مقتضی ہے کہ اسے اپنے وجود اور اپنے نظام کی حفاظت کے لئے جبر اور قوت کے استعمال کا حق حاصل ہو۔ یہ حق ریاست من حیث الریاست کا ذاتی حق (inherent right) ہے۔ (ص۲۶)

غور کیا آپ نے! "ریاست اور حاکمیت کی عین فطرت اس امر کی مقتضی ہے" یہ الفاظ ہٹلر، موسولینی اور لینن کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ جن کے نزدیک ریاست ایک جیتے جاگتے فرد کی طرح اپنا وجود رکھتی ہے جس کی ایک فطرت ہوتی ہے اور (ہندوؤں کی کالی ماتا کی طرح) **قوت کا استعمال** اس فطرت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجود کی حفاظت کے لئے قوت کا استعمال کرے۔

آپ نے دیکھا کہ "قتل مرتد" کے وجوب کے لئے مودودی صاحب کہاں کہاں سے اسناد اور دلائل اور کس کس مقام سے جواز کے فتوے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لا رہے ہیں۔ مقصد تو اپنی بات کے لئے دلیل لانا ہے، اس سے کیا غرض کہ وہ دلیل آتی کہاں سے ہے۔

مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

دلیل کا وزن بھی ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ "یہ قاعدہ اپنی جگہ عالمگیر مقبولیت رکھتا ہے" یعنی کسی قاعدے کے برسرِ حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ "عالمگیر مقبولیت" رکھتا ہو۔ یہ وہی "عالمگیر مقبولیت" ہے جس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے کہ

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ۔ ان یتبعون الا الظن۔ وان ہم الا یخرصون (۶/۱۱۶)
اور اگر تم زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں خود مودودی صاحب لکھتے ہیں:

یعنی بیشتر لوگ جو دنیا میں بستے ہیں علم کے بجائے قیاس و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور ان کے عقائد، تخیلات، فلسفے، اصولِ زندگی اور قوانینِ عمل، سب کے سب قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں۔ بخلاف اس کے اللہ کا راستہ، یعنی دنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ جو اللہ کی رضا کے مطابق ہے، لازماً صرف وہی ایک ہے جس کا علم اللہ نے خود دیا ہے، نہ کہ وہ جس کو لوگوں نے بطورِ خود اپنے قیاسات سے تجویز کر لیا ہے۔ لہٰذا کسی طالبِ حق کو یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ دنیا کے بیشتر انسان کس راستے پر جا رہے ہیں بلکہ اسے پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس راہ پر چلنا چاہیئے جو اللہ نے بتائی ہے۔ چاہے اس راستے پر چلنے کے لئے وہ دنیا میں اکیلا ہی رہ جائے۔ (تفہیم القرآن۔ ۵۷۶-۵۷۵)

لیکن یہ باتیں تو صرف تفسیروں میں لکھنے کی ہیں۔ عمل تو اس اصول پر ہونا چاہیئے کہ اگر اپنے مطلب کے مطابق بات، کتاب اللہ سے ملتی ہے تو اسے بطورِ دلیل پیش کر دیا جائے اور اگر اس کی بجائے (بلکہ اس کے خلاف) دنیا کا کوئی "عالمگیر مقبولیت" والا قاعدہ سامنے آتا ہے جس سے اپنا مقصد پورا ہوتا ہو تو اسے بطورِ شہادت پیش کر دیا جائے!

بہرحال، مودودی صاحب نے یہ اصول بیان فرما دیا کہ اسٹیٹ کو حق حاصل ہے (اور یہ حق اس کا ذاتی ہے جسے کوئی چھین نہیں سکتا) کہ وہ اپنے وجود اور نظام کی حفاظت کے لئے جبر اور قوت استعمال کرے۔ اور چونکہ تبدیلیٔ مذہب سے اسٹیٹ کے وجود کی حفاظت مخدوش ہو جاتی ہے اس لئے اسٹیٹ کو حق حاصل ہے کہ اس تبدیلی کو موت کی سزا کے خوف اور تلوار کی قوت سے روکے۔

اس مسئلہ کے بعد (جس کے ثبوت میں کوئی قرآنی دلیل نہیں پیش کی گئی۔ کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی) مودودی صاحب نکھر کر سامنے آتے ہیں اور صاف صاف الفاظ میں بتاتے ہیں کہ اس قوت کے استعمال کا حق کیسے حاصل ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسٹیٹ کو حق حاصل ہے کہ وہ "جن عناصر کے اجتماع سے تعبیر ہوتا ہے ان کو وہ منتشر ہونے سے بزور روکے اور ہر اس چیز کو طاقت سے دبائے جو اس کے نظام کو درہم برہم کرنے کا رجحان رکھتی ہو"۔ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ (مثلاً) حکومتِ پاکستان نے مودودی صاحب کو اگر جیل خانے بھجوا دیا تھا تو وہ بھی اسی مسئلہ کے تحت تھا جسے عالمگیر مقبولیت حاصل ہے اور جس کے مطابق اسٹیٹ کا یہ ذاتی حق ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے انتشار پیدا کرنے والے عناصر کو بزور روکے۔

لیکن

لیکن قوت کے استعمال کا حق صرف.... یہاں پہنچ کر مودودی صاحب واضح الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ نہیں! یہ حق ہر اسٹیٹ کے کارندوں کو نہیں پہنچتا۔ یہ حق صرف انھیں پہنچتا ہے جو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے ذمے دار ہوں۔ یہ حق حکومتِ پاکستان کو نہیں پہنچتا۔ یہ حق صرف اسلامی حکومت اور ان کے امیر کو پہنچتا ہے کیونکہ ان کے ہاتھوں سے جو حکومت قائم ہوگی وہ حق کی حکومت ہوگی۔ چنانچہ ارشاد ہے:

> ہمارے نزدیک خدا کی حاکمیت کے سوا ہر دوسری حاکمیت یا ریاست کی تعمیر سرے سے ناجائز ہے۔ اس لئے جو ریاست بجائے خود ناجائز بنیاد پر قائم ہو اس کیلئے ہم اس بات کو جائز تسلیم نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے ناجائز وجود اور غلط نظام کی حفاظت کے لئے قوت استعمال کرے..... (اپنے وجود کی حفاظت کیلئے جبر اور قوت کا استعمال کرنا ریاست کا ذاتی حق ہے۔ لیکن) اگر کوئی چیز اس حق کو باطل بنا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جو ریاست اس حق سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہو وہ آپ ہی باطل پر قائم ہوئی ہو۔ اسلئے کہ باطل کا وجود بجائے خود ایک جرم ہے اور اگر وہ اپنے قیام و بقا کے لئے طاقت سے کام لیتا ہے تو یہ شدید تر جرم ہو جاتا ہے۔ (ص۲۶)

دیکھا آپ نے کہ "قتلِ مرتد" کی تان کہاں آکر ٹوٹی ہے؟ یعنی

(i) ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ لوگوں کو بہ جبر اپنے حلقۂ اقتدار میں رکھے۔
(ii) لیکن یہ حق صرف اس ریاست کو حاصل ہے جو حق پر قائم ہوئی ہو۔
(iii) حق پر وہی ریاست قائم ہوتی ہے جس میں شریعت کا نظام رائج ہو۔
(iv) نظامِ شریعت ملا کے ہاتھوں رائج ہوسکتا ہے۔
(v) آج یہ نظام اسلامی جماعت کے ہاتھوں قائم ہوگا۔ اس لئے
(vi) جب زمامِ اقتدار اسلامی جماعت کے ہاتھ میں آئیگا تو انھیں یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ ہر اس عنصر کے خلاف جو ان کی دانست میں اس نظام کے انتشار کا باعث ہو قوت اور جبر کا استعمال کریں۔

دیکھا آپ نے کہ بات کہاں سے چلی اور کہاں جا پہنچی؛ اور اس بحر کی تہ سے اچھل کر کیا نکلا؟ اسی لئے تو کہتے تھے کہ

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اٹھا واعظ　　کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے!

قتلِ مرتد کی روایات کیوں وضع ہوئیں؟ اب آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ قرآن کی ایسی واضح تعلیم اور اتنے کھلے کھلے احکام (بابت آزادیٔ مذہب) کے علی الرغم قتلِ مرتد سے متعلق روایات کیوں وضع کی گئیں! صاف ظاہر ہے کہ جب تک یہ مقدس بنیاد نہ تیار کی جاتی اس پر استبداد اربابِ شریعت کی یہ قہرمانی عمارت کبھی تعمیر نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ سب کچھ

اس لئے کیا گیا کہ قوت کو اپنے ہاتھ میں رکھا جائے۔ لیکن اس "مقدس استبداد" کی تفصیل سننے سے پہلے مختصراً یہ دیکھنے جایئے کہ قوت کسے کہتے ہیں۔ حکومت کا تصور کس طرح وجود میں آیا اور قرآن نے اس کا کیا علاج کیا۔ اس کے بعد یہ سمجھ میں آجائے گا کہ "قتل مرتد" سے حقیقی مفہوم کیا تھا۔

انسانی تاریخ کے صفحات کو دیکھئے۔ یہاں سے وہاں تک ایک مسلسل داستان نظر آئیگی حاکم و محکوم اور صید و صیاد کی۔ جن لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اقتدار حاصل کر لیا انہوں نے دوسروں کو اپنی محکومیت کے پنجے میں جکڑ لیا اور اس کے بعد . . . .

ملوکیت اور پیشوائیت

ہر حربہ استعمال کیا اس مقصد کے لئے کہ جو ایک دفعہ محکوم ہو چکا ہے وہ حلقۂ محکومیت سے نکلنے نہ پائے۔ اس مقصد کے لئے ملوکیت نے انسانی جسم کے لئے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بنوائیں اور پیشوائیت (priesthood) نے انسانی ذہن کی جکڑ بندیوں کے لئے عقیدت و ارادت کے دام ہمرنگ زمین تیار کئے۔ ان دونوں کے باہمی سمجھوتے نے راجہ کو ایشور کا اوتار، بادشاہ کو ظل اللہ اور کنگ کو حقوقِ خداوندی (divine rights) کا حامل بنا دیا۔ تاج کی وفاداری اور تخت کی اطاعت شعاری، فرائض خداوندی قرار پا گئے۔ مغرب میں جب بادشاہت کی شخصی حکومت کے خلاف احتجاج ہوا تو وہاں کے سیاست دانوں نے پرانی اصطلاحوں کی جگہ چند جدید اصطلاحات وضع کیں اور اس طرح عوام کو فریب دیدیا کہ حاکمیت کا استبداد کہن، سلطانی جمہور میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس نظریے کی تبدیلی کے بعد انھوں نے پرانے بتوں (idols) کی جگہ نئے نئے بت تراشنے شروع کئے۔ اب تخت و تاج کی جگہ وطن (my country) نے لے لی۔ یہ جمہوریت کی اصطلاح تھی۔ اس کے برعکس فاشزم نے وطن کی جگہ ریاست (state) کی totalitarian state کی اصطلاح وضع کی: "ریاست یا مملکت افراد سے بلند ہے"۔ "افراد کی ہستی ریاست کے لئے ہے"۔ "ریاست ذاتی حقوق (inherent rights) کی مالک ہے جو اس سے کسی صورت میں بھی چھینے نہیں جا سکتے۔ جو ان حقوق میں دخل اندازی کا ارادہ کرے وہ غدار ہے۔ باغی ہے۔ ریاست کو حق حاصل ہے کہ اسے فنا کے گھاٹ اتار دے۔ ریاست کی حفاظت کے لئے سب کچھ جائز ہے، جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ریاست (state) ایک مجرّد اصطلاح (abstract term) ہے جس کی آج تک کوئی جامع تعریف نہیں ہو سکی۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ اسٹیٹ بالآخر کہتے کسے ہیں۔ ان سیاسی مہرہ بازوں نے عوام کو اس مجرد اصطلاح کے گورکھ دھندے میں الجھا دیا اور اس کے پردے میں وہ سب کچھ کرتے چلے گئے جو ملوکیت کیا کرتی تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ملوکیت کے دور میں لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ ان پر جور و استبداد کس کی طرف سے ہو رہا ہے، لیکن اب یہ صورت ہو گئی کہ قتل ہو رہے ہیں اور کچھ معلوم نہیں کہ قاتل کون ہے اور خون بہا کس کے ذمے ہے۔ یہ سب کچھ اسٹیٹ کے لئے ہوتا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اسٹیٹ کہتے کسے ہیں۔ اگر آپ غور کریں تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جس طرح ذہن انسانی کے عہد طفولیت میں، پیشوائیت نے دیوتاؤں کا وجود پیدا کیا تھا اور ان کے نام پر سب کچھ روا رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح عہد جدید میں اسٹیٹ کے وجود کا بت تراشا گیا ہے۔ صرف الفاظ بدلے ہیں، روح وہی ہے۔

قرآنی انقلاب

قرآن نے آکر کہا کہ حاکم اور محکوم کا تصور ہی باطل ہے۔ انسانوں کو مل جل کر رہنا ہے۔ اس کیلئے انھیں ایک معاشرتی نظام کی ضرورت ہے۔ یہ معاشرتی نظام دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ ایک وہ جسے انسان اپنے قیاسات کی رُو سے قائم کریں۔ دوسرے وہ جسے وحی کے عطا فرمودہ اصولوں کی روشنی میں قائم کیا جائے۔ وحی کی رُو سے قائم کردہ معاشرہ کا نام اسلامی زندگی ہے۔ قرآن نے بتایا کہ اسلامی معاشرے کے قیام کی صورت یہ ہے کہ جو لوگ بغیر کسی جبر و اکراہ کے اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ فی الواقعہ وحی کی رُو سے قائم ہونے والا معاشرہ، انسانی زندگی کے لئے بہترین معاشرہ ہے، وہ (اس اشتراکِ ایمان کے رشتے میں منسلک ہو کر) باہمی نظم و ربط پیدا کریں۔ اس سے اس معاشرے کا وجود عمل میں آجائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس معاشرہ کی بنیاد ایمان پر ہے۔ پھر سن لیجئے کہ ایمان سے مراد ہے اس حقیقت کو بطیب خاطر تسلیم کرنا کہ انسانی زندگی کے لئے صحیح معاشرہ وہی ہے جو وحیٔ خداوندی کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ چونکہ اس معاشرہ کی بنیادی ایمان (ideology) پر ہے اور ایمان

اسلامی نظام کی بنیاد دل کی رضامندی پر ہے

صرف اس وقت ایمان کہلا سکتا ہے جب وہ دل کی رضامندی سے قبول کیا جائے۔ اس لئے اس معاشرہ کے قیام میں جبر و اکراہ کا تصور ہی ناممکن ہے۔ اس معاشرہ کے افراد اپنے دل کے فیصلے سے اس نظام کے اجزا بنتے ہیں۔ اس لئے جس طرح وہ شخص اس نظام کا جزو نہیں بن سکتا جس کا دل اس نظام کی اصلیت کی گواہی نہ دے، اسی طرح وہ شخص بھی اس نظام کا جزو نہیں رہ سکتا جو اس نظام میں داخل تو ہو جائے لیکن اس کے بعد اس کا دل اس کی اصلیت سے مطمئن نہ ہو۔ قرآن جس طرح اول الذکر کو اس نظام کا جزو بننے پر مجبور نہیں کرتا اسی طرح ثانی الذکر کو بھی زبردستی اس نظام کا جزو بنے رہنے پر مجبور نہیں کرتا۔ اس لئے کہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس نظام کی بنیاد ہی دل کی رضامندی (ایمان) پر ہے۔ جہاں جبر آیا یہ نظام ٹوٹا۔ جبر سے محکوم تو اکٹھے رکھے جا سکتے ہیں، ایک صالح نظام کے اجزا یکجا نہیں رکھے جا سکتے۔ ایک صالح نظام کے افراد کا باہمی تعلق، ائتلافِ قلب سے ہوتا ہے یعنی دل و نگاہ کی ہم آہنگی اور یک رنگی۔ یہ ظاہر ہے کہ قلب و نگاہ کی ہم آہنگی جبر سے پیدا ہی نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ سے کہہ دیا کہ دلوں کی یک رنگی (ائتلافِ قلوب) جو اس نظام کے افراد کی خصوصیت ہے، صرف ایمان سے پیدا ہو سکتی ہے۔ لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبھم (۸/۶۳) اگر تو جو کچھ زمین میں ہے، سب کچھ خرچ کر دیتا، تو بھی ان کے دلوں میں ائتلاف پیدا نہ کر سکتا۔ جو افراد قلبی ہم آہنگی کے بجائے دیگر مقاصد کی خاطر ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں ان کے متعلق قرآن نے بتایا کہ تحسبھم جمیعاً و قلوبھم شتّٰی (۵۹/۱۴) تو انھیں اکٹھا سمجھتا ہے حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں۔ اور جن لوگوں کو زبردستی باندھ کر رکھا جائے ان کا اس طرح اکٹھا رہنا، منافقت کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ بطیب خاطر نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ اس نظام کے اجزا کس طرح بن سکتے ہیں جس نظام کی بنیاد ہی قلبی ہم آہنگی پر ہو۔ اسی لئے وہ کہتا ہے کہ جن لوگوں کا اس نظام کی اصلیت پر ایمان نہ رہے، انھیں نظام سے نکل جانے دیجئے۔ ان کی جگہ خدا ایسا گروہ لے آئے گا جس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہوں گی جن سے اس نظام کا قوام تیار ہوتا ہے۔ سنئے کہ

وہ خصوصیات کیا ہیں۔ فرمایا:

یا یھا الذین آمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ۔ اذلۃ
علی المومنین اعزۃ علی الکافرین۔ یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم۔ ذالک
فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ واللہ واسع علیم (۵/۵۴)

اے ایمان والو۔ تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے مرتد ہو جائے گا۔ تو قریب ہے کہ اللہ ایک ایسا گروہ پیدا کر دے گا جنھیں خدا دوست رکھے گا اور وہ خدا کو دوست رکھیں گے۔ مومنوں کے مقابلے میں نہایت نرم۔ لیکن کفار کے مقابلے میں نہایت سخت۔ اللہ کی راہ میں جان لڑا دینے والے۔ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنے والے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس گروہ کو چاہے عطا فرما دے۔ وہ اپنے فضل میں بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کا حال جاننے والا ہے۔

ذرا سوچئے کہ اگر ان لوگوں کو جو دل سے اس نظام کے اجزا بن کر نہ رہنا چاہیں موت کے خوف سے اس نظام کے جزو بنے رہنے پر مجبور کیا جائے تو کیا وہ ان خصوصیات کے حامل ہو سکیں گے کہ

(۱) وہ خدا کو دوست رکھیں۔
(۲) اپنی جماعت کے دیگر مخلص ارکان کے ساتھ ان کا سلوک نہایت نرم روی اور محبت قلبی کا ہو۔
(۳) جماعت کے مخالفین کے مقابلے میں نہایت سخت ہوں۔
(۴) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔ اور
(۵) خدا کی راہ میں جانیں لڑا دیں۔

اس لئے ایسے لوگ کبھی اسلامی نظام کے اجزا بنا کر نہیں رکھے جا سکتے۔ اسلامی نظام کے اجزا صرف انہی کو قرار دیا جا سکتا ہے جو ان خصوصیات کے حامل ہوں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اسلام یقیناً اپنے نظام کا تحفظ چاہتا ہے، لیکن اس کے تحفظ کی

قلبی اطاعت

قوت کا راز افراد ملت کے ایمان محکم میں ہوتا ہے جو دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ جن لوگوں کو زبردستی ملت کے ساتھ باندھ کر رکھا جائے ان کا وجود نظام کے استحکام کی بجائے، اس کی سخت کمزوری کا باعث ہوتا ہے اس کا کسی زمانے میں خود مودودی صاحب کو بھی اقرار تھا۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "الجہاد فی الاسلام" میں لکھتے ہیں (جو ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی)۔

اگر کوئی شخص سر پر تلوار چمکتی ہوئی دیکھ کر لا الہ الا اللہ کہہ دے مگر اس کا دل بدستور ما سوا اللہ کا بتکدہ بنا رہے تو یہ تصدیق بالقلب کے بغیر اقرار باللسان اس کے لئے کچھ بھی نافع نہیں اور اسلام کے لئے اس کی حلقہ بگوشی قطعاً بیکار ہے۔ یہ تو خیر بڑی چیز ہے۔ دنیا کی معمولی تحریکیں بھی جن کا منشا محض دنیوی مقاصد کا حصول ہوتا ہے اپنی کامیابی کیلئے ایسے بزدل پر کبھی بھروسہ نہیں کر سکتیں، جو صرف زبان سے ان کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوں مگر دل سے ان کے مؤید نہ ہوں۔ بیدل

غیرمخلص اور جھوٹے پیروں کو لیکر آجتک کسی تحریک نے کامیابی کا منہ نہیں دیکھا ہے اور یقیناً ایسے گوشت پوست کے لوتھڑوں کو لیکر جو صداقت کی روح سے بالکل خالی ہوں کوئی شخص دنیا کے میدان مسابقت میں قدم رکھنے کی جرأت اور فوز و فلاح تک پہنچنے کی امید نہیں کرسکتا۔ پھر بھلا غور کرو کہ جس دین کے پیش نظر دنیا کی کامیابی نہیں بلکہ آخرت کی فوز و فلاح ہو۔ جو دین نیت اور اعتقاد کو عمل کی بنیاد قرار دیتا ہو، جو دین خلوص و صداقت کی روح کے بغیر عمل کی کوئی قیمت نہ سمجھتا ہو . . . . کیا ہوسکتا تھا کہ وہ خلوص و صداقت کو چھوڑ کر مجبورانہ اطاعت اور بے چارگی کے اقرار پر قناعت کرتا؟ . . . اگر وہ ایسا کرتا تو کیا اسے وہ کامیابی حاصل ہوسکتی تھی جو اس نے فی الحقیقت حاصل کی ہے؟ (ص ۱۲۹-۱۲۵)

یہی وہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر قرآن کہتا ہے کہ جو لوگ خلوص و صداقت اور تصدیق قلب سے تمہاری آئیڈیالوجی کے مؤید نہ رہیں ان کی مجبورانہ اطاعت اور بے چارگی کے اقرار کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اس لئے انھیں اس قسم کی اطاعت پر مجبور کرکے اپنے نظام کا جزو بنائے رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان سے کہدو کہ تمہارے جانے سے اس نظام کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس نظام کی تقویت کا راز ان لوگوں کے ایمان میں ہے جن کی کیفیت یہ ہے کہ یحبھم و یحبونہ . . . . یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم۔ (۵/۵۴)

دنیا کی سٹیٹ اپنی حفاظت کیلئے بیشک ایسے جیوش دعا کر اپنے ساتھ رکھتی ہیں جنھیں بنوک شمشیر باندھ کر ساتھ رکھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن انھیں فرعونی اسٹیٹ اور طاغوتی نظام قرار دیتا ہے۔ اسلامی نظام اور قرآنی اسٹیٹ میں جور و تغلب اور جبر و اکراہ کو کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔ یہ اسٹیٹ ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو اس راہ میں سر جھکانے سے پہلے دل جھکا چکے ہوتے ہیں۔ لہذا جس کا دل اس اسٹیٹ کے بنیادی تصورات سے سرکشی اختیار کرچکا ہو وہ اس اسٹیٹ کے اجزائے ترکیبی میں شامل نہیں رہ سکتا۔ اس اسٹیٹ میں اس کا مقام وہی ہے جہاں اس قسم کے افراد رہتے ہیں جن کا دل اس اسٹیٹ کی آئیڈیالوجی کا قائل نہیں لیکن وہ اس کے سایہ امن و عاطفت میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں انھیں ذمی یا مستامن کہا جاتا ہے۔ البتہ اگر یہ لوگ (خواہ منافقانہ طور پر نظام ملت کے

بغاوت کی سزا

اجزاء رہتے ہوئے یعنی مسلمان کہلاتے ہوئے۔ اور خواہ کفر کی آغوش میں آکر ذمی بنکر رہتے ہوئے) اسلامی نظام کو الٹنے کی کوشش کریں تو ان کا دفعیہ بزور شمشیر کیا جائے گا۔ قرآن نے اس باب میں واضح حکم دیا ہے۔ ارشاد ہے۔

انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض۔ ذالک لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم (۵/۳۳)

بلاشبہ جو لوگ خدا اور رسول (یعنی اسلامی نظام) کے خلاف جنگ کریں اور ملک میں فساد برپا کریں تو ان کی سزا یہ ہے کہ انھیں قتل کردیا جائے۔ یا سولی پر چڑھا دیا جائے۔ یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیئے جائیں (یا انھیں الٹی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال دی جائیں) یہ ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کیلئے عذاب عظیم ہے۔

یعنی قرآن کی رو سے بغاوت کی سزا موت ہے یا دوسری سزاؤں میں سے کوئی سزا جسے اقتضائے حالات کے مطابق مناسب سمجھا جائے۔ بغاوت کی صورت میں بھی قرآن نے اتنی گنجائش رکھی ہے کہ اگر باغی گرفتاری سے قبل اپنے فعل سے پشیمان ہو کر تائب ہو جائیں تو انھیں معاف کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آیۂ ماسبق سے متصل یہ آیت ہے۔

الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیہم فاعلموا ان اللہ غفور رحیم (۵/۳۴)

لیکن اگر وہ، قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پالو، توبہ کر لیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

مرتد اور باغی میں فرق

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن نے مرتد اور باغی کو الگ الگ صفوں میں رکھا ہے۔ مرتد وہ ہے جسے اسلامی آئیڈیالوجی سے اختلاف ہو جائے لیکن وہ اس کے بعد مملکت کا امن پسند شہری بن کر رہنا چاہے۔ قرآن کی رو سے اس کی کوئی سزا نہیں کیونکہ اسلامی آئیڈیالوجی سے اختلاف رکھنا کوئی جرم نہیں۔ اس کے برعکس باغی وہ ہے جو اسلامی نظام کو الٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ جرم ہے اور اس کی سزا قرآن نے مقرر کر دی ہے۔ مودودی صاحب نے قتلِ مرتد کے وجوب میں جس قدر دلائل پیش کئے ہیں وہ درحقیقت مملکت کے خلاف بغاوت سے متعلق ہیں۔ (آپ ایک بار پھر ان کے پیش کردہ دلائل کو سامنے لائیے، بات واضح ہو جائے گی)۔ اس طرح انھوں نے دونوں (بغاوت اور ارتداد) میں التباس پیدا کر کے قتلِ مرتد کو (بزعمِ خویش) عقلاً بھی ثابت کر دیا ہے۔ حالانکہ جو کچھ انھوں نے ثابت کیا ہے وہ فقط یہ ہے کہ دنیا کی کوئی مملکت بغاوت کی اجازت نہیں دے سکتی۔ اسی طرح اسلامی مملکت بھی باغیوں کو کھلا نہیں چھوڑ سکتی۔ اس کے لئے کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ قرآن میں اس کے متعلق واضح حکم موجود ہے۔ لیکن اس آیت کو انھوں نے کہیں درج نہیں کیا۔ اس لئے کہ اگر اسے درج کر دیتے تو پڑھنے والوں کو معلوم ہو جاتا کہ قرآن باغی اور مرتد میں فرق کرتا ہے اور مودودی صاحب باغیوں سے متعلق دلائل و احکام کو مرتدین سے چپکا کر اپنے دعوے کا اثبات چاہتے ہیں۔

یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی فرد یا افراد کا گروہ، اسلام سے ارتداد کے ساتھ ہی مملکت کے خلاف بغاوت بھی شروع کر دے۔ اس صورت میں ان کی سرکوبی، جرمِ بغاوت کی بنا پر کی جائے گی نہ کہ ارتداد کی وجہ سے۔ اگر تاریخ میں خلافتِ راشدہ کا کوئی واقعہ ایسا ملتا ہے جس میں "مرتدین" کے خلاف جنگ کی گئی ہو تو اس کی یہی توجیہ ہو سکتی ہے کہ ان مرتدین نے بغاوت بھی کی ہو گی۔ جس کی بنا پر ان کے خلاف اس قسم کی کارروائی کی گئی۔ اس لئے کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ صحابہ کبار کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ انھوں نے قرآن کی ایسی واضح تعلیم کی اس قدر کھلی ہوئی مخالفت کی ہو گی۔ مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا حضرات اس کی جرأت کریں تو کریں، ہم تو ایسا نہیں کر سکتے۔

پھر کیا ہوا؟

یہ ہے نقش اس نظام کا جس کی تشکیل قرآن چاہتا ہے۔ یعنی ان افراد پر مشتمل نظام جو اس نظام کے اساسی اور بنیادی اصولوں کو نصب العینِ حیات قرار دے چکے ہوں اور بطیبِ خاطر اس نظام کے قیام کو

اپنی زندگی کا مقصد بنا چکے ہوں۔ اس نظام میں جبر اور استبداد کا سوال تک ہی پیدا نہیں ہوتا۔ طاغوتی نظام اور قرآنی نظام میں یہی تو فرق ہے۔ یہ نظام رسول اللہ اور صحابہؓ نے قائم کیا۔ لیکن جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی تو اسلامی نظام کا یہ نقشہ بھی یکسر بدل گیا جس میں نظام کی تشکیل بطیب خاطر اور برضا و رغبت ہوتی تھی۔ اب حاکم و محکوم کی تفریق پھر پیدا ہو گئی اور پھر وہی جبر و اکراہ شروع ہو گیا۔ ملوکیت کے ساتھ ہی ثنویت (dualism) بھی آ گئی اور دین، سیاست اور مذہب میں بٹ گیا۔ سیاست کے علمبردار ارباب حکومت تھے اور مذہب کے نمائندے ارکانِ شریعت۔ اربابِ شریعت نے دیکھا کہ بادشاہ کے خلاف سرکشی کی سزا تو قتل ہے لیکن ان کے خلاف سرکشی کی کوئی سزا ہی نہیں۔ وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ بادشاہ کو تو اتنے اختیارات حاصل ہو جائیں، اور ارباب شریعت خالی فتوے دینے کیلئے رہ جائیں۔ انھوں نے سوچا کہ مذہب کے خلاف سرکشی (ارتداد)

وضع روایات

کی سزا بھی موت ہونی چاہیے۔ قرآن سے تو اس کی سند مل نہیں سکتی تھی اس لئے انھوں نے وہی کیا جو ایسی صورت میں مذہب کے دوسرے گوشوں میں کیا گیا تھا۔ اس کے لئے آسانی سے چند روایات وضع کیں اور انھیں منسوب کر دیا حضور رسالتمآبؐ کی طرف۔ لیجئے! اربابِ مذہب کے اختیارات، اربابِ حکومت سے بھی بڑھ گئے۔ آپ شاید دل میں سوچیں کہ ان کے اختیارات، اربابِ حکومت سے کس طرح بڑھ گئے؟ یہ بھی سن لیجئے۔

اس وقت تک آپ یہی سمجھتے چلے آئے ہوں گے کہ مرتد کے معنی ہیں وہ شخص جو اس امر کا اعلان کر دے کہ میں اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی مسلمان کے بجائے کافر ہونا چاہتا ہوں۔ چنانچہ مودودی صاحب نے بھی اپنے مقالہ میں اس امر کی بڑی احتیاط

مرتد کون ہے؟

برتی ہے کہ قارئین کا ذہن اس مفہوم کے علاوہ کسی اور مفہوم کی طرف منتقل ہی ہونے نہ پائے۔ لیکن اربابِ شریعت کے نزدیک مرتد کی صرف یہی تعریف definition نہیں۔ آپ آئے دن پڑھتے ہوں گے کہ فلاں صاحب پر کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا۔ اس خبر سے نہ تو آپ پر کوئی خاص اثر ہوتا ہے نہ اس شخص پر جس پر کفر کا فتویٰ لگتا ہے۔ بلکہ کفر کے فتووں نے اب مذاق کی شکل اختیار کر لی ہے لیکن "اسلامی حکومت" (یعنی مسلمان بادشاہوں کی حکومت) میں کفر کا فتویٰ مذاق نہیں تھا۔ جس پر کفر کا فتویٰ لگ جاتا تھا، وہ مرتد سمجھ لیا جاتا تھا اور مرتد کی سزا قتل تھی۔ اس لئے کفر کے فتوے سے سزائے موت واجب ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جس پہ کفر کا فتویٰ لگ جاتا تھا اس کا خون مباح ہو جاتا تھا۔ آپ فقہ کی کتابوں میں دیکھئے۔ لمبی چوڑی بحثیں اس موضوع پر ملیں گی کہ ایک مسلمان کس طرح "عقائد" کے ذرا ذرا سے اختلاف پہ کافر (یعنی مرتد) ہو جاتا ہے۔

اب آپ سوچیے کہ مُلّا کے اختیارات زیادہ وسیع تھے یا بادشاہ کے؟ بادشاہ کو جرم بغاوت ثابت کرنے کیلئے پھر بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا لیکن مُلّا کے لئے تکفیر کا بہانہ کچھ دشوار نہ تھا۔ اس کیلئے فقط اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ فلاں شخص کے عقائد صحیح نہیں۔ یا اس کا فلاں عقیدہ، جمہور کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ اس کے بعد اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جاتا اور اسے سر بازار قتل کر دیا جاتا۔ نہ کوئی وکیل نہ کہیں اپیل۔ یہ صورتِ حالات بادشاہوں کے لئے بھی بڑی مفید تھی۔ وہ اگر کسی کو اپنی مصلحتوں کی بنا پہ قتل کرنا چاہتے لیکن اس کے خلاف کوئی سنگین جرم ثابت نہ کر سکتے تو مُلّا سے اس کے کفر کا فتویٰ لے لیا جاتا اور اس کے بعد اسے آسانی سے حوالۂ دار و رسن کر دیا جاتا۔ "شریعت" کی رُو سے باغی کو تو امان بھی دی جا سکتی تھی لیکن مرتد کیلئے کہیں امان کی جگہ نہ تھی۔ نیز اس کے قتل کے خلاف کوئی اور شخص بھی زبان تک

نہیں ہلا سکتا تھا۔ کیونکہ ایسا کرنا "شریعت" کی تنقید و تنقیص تھی اور اس کی سزا بھی موت! ۔ اس کفرسازی نے کیا قیامت ڈھائی ہے، اس کا اندازہ لگانا ہو تو (خلافت کے بعد) مسلمانوں کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ اس کا کونسا صفحہ ہے جو خون کے دھبوں سے داغدار نہیں؟ اس میں ایک ایک عقیدہ کے نام پر خود مسلمانوں نے دوسرے مسلمانوں کو جس بیدردی اور بے دردنغی سے قتل کیا ہے، کفار کی مسلح کوششوں نے بھی ان کے ساتھ ایسا نہ کیا ہوگا۔ نہایت راستباز

خونِ ناحق کی ندیاں

نکوکار، خداترس مسلمان ہے لیکن اسے ایک جزئی سے عقیدے میں اختلاف ہے۔ بس اس اختلاف سے کفر کا فتویٰ لگا، اس فتوے نے اسے مرتد قرار دیدیا، اور ملا کی کند چھری سے اسے ذبح کردیا گیا۔ مثال کے طور پر ایک عقیدۂ خلق قرآن کو لیجئے۔ معتزلہ نے جب تنزیہہ ذات اور نفی صفات کا عقیدہ نکالا تو اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ قرآن (کلام اللہ) مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ اس وقت شاید آپ کہیں کہ بالآخر یہ سوال ہی کیا تھا جسے اس طرح اٹھایا گیا لیکن تاریخ کے اوراق سے پوچھئے کہ اس ایک سوال نے خون ناحق کی کسقدر ندیاں بہادیں؟ دوسری صدی ہجری میں جعد بن درہم نے قرآن کے مخلوق ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کی پیروی میں جہم بن صفوان نے اس کا اعلان کیا۔ محدثین نے اس قول کو اسلام کے خلاف قرار دیا اور اس عقیدے کے حاملین کو مرتد ٹھہرایا۔ اس جرم کی سزا میں خالد بن عبداللہ قسری والیٔ عراق نے جعد کو عید اضحیٰ کے دن بطور قربانی کے ذبح کیا۔ اور جہم کو سلم بن احوز نے مرو میں قتل کر ڈالا۔ مامون الرشید کے عہد میں حالات نے پلٹا لیا اور وہ خود اور اس کے درباری قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہوگئے۔ اب محدثین پر کفر کے فتوے لگنے شروع ہوئے اور وہ جرم ارتداد کی سزا میں قتل ہونے لگے۔ اکثر علماء نے مجبوراً قرآن کو مخلوق کہہ کر اپنی جانیں بچائیں لیکن بہت سے اپنے عقیدے پر قائم رہ کر سخت ترین اذیتیں جھیلتے اور موت کے گھاٹ اترتے رہے۔ انہی میں امام احمد بن حنبل جیسی شخصیت بھی تھی۔ امام صاحب کو جس طرح قید و بند کے عذاب میں مبتلا رکھا گیا اس کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ انھیں دربار میں بلا کر کوڑوں سے پٹوایا جاتا تھا اور جب وہ بیہوش ہوجاتے تو پھر قید خانے میں بھجوا دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ ایک دن، دو دن نہیں بلکہ پورے اڑھائی سال تک جاری رہا۔ معتصم (مامون الرشید کا جانشین) ان سب لوگوں کو قتل کردیا کرتا تھا جو قرآن کو غیر مخلوق کہتے تھے لیکن امام صاحب کے قتل کی جرأت اس نے نہیں کی کیونکہ ان کے ساتھ عوام کی عقیدت بہت گہری تھی۔ معتصم کے جانشین، واثق نے بھی خون کی ان ندیوں میں اضافہ کیا، حتیٰ کہ احمد بن نصر کو اسی عقیدے کی بنا پر خود اپنے ہاتھ سے قتل کرکے "ثوابِ عظیم" کا مستحق بنا۔ احمد کے جسم کو سامرا میں سولی پر چڑھایا گیا اور اس کے سر کو بغداد بھیجدیا۔ کان میں ایک رقعہ لٹکا دیا جس میں لکھا تھا:

یہ احمد بن نصر مشرک اور گمراہ کا سر ہے جس کو امیرالمومنین نے بغرض تقرب الٰہی اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔

خدا خدا کرکے متوکل نے اس وحشت و بربریت کو ختم کیا اور محدثین کو اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا۔ مامون سے واثق تک تین خلفاء کے زمانے میں یہ ایک جزئی اختلاف جسقدر خونریزی اور غارتگری کا موجب بنا اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس وحشت و بربریت کا شرعی جواز وہ چند روایات تھیں جو قتل مرتد کے وجوب میں وضع کرلی گئی تھیں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جسے مسلمانوں کی تاریخ میں اسلام کا درخشندہ عہد کہا جاتا ہے یعنی عباسیوں کا دور، اور عباسیوں میں بھی مامون الرشید کا زمانہ۔ جب اسقدر "مہذب زمانے" میں

جب کہ علم وفضل کا چرچا عام تھا اور "اسلامی تہذیب وتمدن" اپنے عہدِ شباب پر تھا، فتنۂ تکفیر وارتداد کی پیدا کردہ سبعیت وبہیمیت کا یہ عالم تھا تو مسلمانوں کے تاریک عہد میں جو کچھ ہوتا ہوگا اس کا اندازہ خود لگا لیجئے۔ ارتداد کے الزام کے ڈر سے لوگوں کی حالت یہ ہو جاتی تھی، انھیں اپنے جیب میں عقائدِ صحیحہ کا سارٹیفکیٹ رکھنا پڑتا تھا کیونکہ ملا کے اس سارٹیفکیٹ کے بغیر ہر وقت خدشہ رہتا تھا کہ نہ جانے کس وقت کوئی کفر کا فتوے لگا دے اور سر بھٹے کی طرح اڑ جائے۔ پادریوں کے مظالم کی شہادت میں یورپ کے مذہبی احتساب inquisition کو بطورِ مثال پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن خود ہماری تاریخ میں عقائد کے اختلاف کی بنا پر جسقدر ظلم کیشیاں اور ستم رانیاں ہوئی ہیں وہ پادریوں کے "احتساب" سے کچھ کم نہیں۔

سب سے بڑا نقصان

"ارتداد" کے نقاب میں امتِ مسلمہ کے اس قدر بے گناہ افراد کا خونِ ناحق بھی کچھ کم نقصان نہیں۔ لیکن اس "مذہبی تشدد" سے ایک نقصان اس سے بھی کہیں زیادہ ہوا۔ قرآن کریم نے قدم قدم پر تدبر وتفکر، اور تحقیق وتدقیق کی تاکید کی ہے۔ اس سے قرآنی حقائق ہر زمانے میں بے نقاب ہوتے تھے۔ اور اسی کو اللہ تعالیٰ نے قرآنی تعلیم کی صداقت ثابت کرنے کا طریق بنایا تھا۔ لیکن جب اربابِ مذہب نے یہ حکم صادر کر دیا کہ جو شخص کوئی ایسی بات کہے جو ان کے عقیدہ کے خلاف ہو، تو اسے مرتد قرار دے دیا جائے گا، تو قرآن پر غور وتدبر کا دروازہ بند ہو گیا اور اُمّت کے ذہن پر تقلیدِ جامد کے تالے پڑ گئے۔ نتیجہ یہ کہ دنیا کہیں سے کہیں جا پہنچی اور یہ اُمّت جسے نوعِ انسان کی امامت و لیڈرشپ کے لئے پیدا کیا گیا تھا وہیں کھڑی ہے جہاں ہزار برس پہلے تھی۔ ہمارے زمانے میں اس جمود اور تقلید نے صورتِ حالات کو بڑا ہی نازک بنا دیا ہے۔ ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہر بات کو دلیل و برہان کی رو سے ماننا چاہتا ہے لیکن ہماری قدامت پسند مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کا اطمینان نہیں کرایا جاتا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ نوجوان طبقہ ہر بات کو بلا دلیل و برہان، اسی طرح مانتا چلا جائے جس طرح یہ ان سے منوانا چاہتے ہیں۔ وہ اس طرح ماننے پر آمادہ نہیں۔ نتیجہ یہ کہ یہ طبقہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قدامت پرست طبقہ کو اس پر غصہ آتا ہے اور بجائے اس کے کہ سوچے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ وہ انہیں ملحد، بے دین، مغرب زدہ فرنگی مآب، بلکہ مرتد اور کافر قرار دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حالات کسی قوم کے لئے بھی خوش آئند نہیں ہو سکتی اور اس قوم (ملّتِ اسلامیہ) کیلئے تو کسی طریق سے بھی قابلِ برداشت قرار نہیں دی جا سکتی جس کی بنیاد ہی دین پر ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ہمارا مذہب پرست طبقہ اس کا قطعی احساس نہیں کرتا اور ابھی تک اسی روش پر چلے جانے پر مصر ہے کہ جہاں کسی نے کوئی ایسی بات کی جو ان کے خیال سے مختلف ہو، اسے کافر و مرتد قرار دے دیا! کس قدر تاسف انگیز ہے یہ صورتِ حالات!!

خاتمۂ کلام

قتلِ مرتد کے متعلق مودودی صاحب کے خیالات اور دلائل آپ کے سامنے آ چکے۔ ان کے خلاف قرآن کریم کے متعلقہ مقامات بھی آپ دیکھ چکے۔ ان کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرمائیے کہ کیا قرآن کریم کی رو سے ایک مسلمان کے لئے

تبدیلِ مذہب سزائے موت کا مستوجب ہوتی ہے اور کیا قرآن کا یہی منشا ہے کہ ایسے لوگوں کو جن کا دل اسلامی آئیڈیالوجی سے مطمئن نہ ہو، موت کے ڈر سے باندھ کر مسلمان بنائے رکھا جائے؟ اگر آپ سمجھتے ہوں کہ قرآن کا فی الواقعہ یہ فیصلہ اور ایسا منشا نہیں تو پھر سوچئے کہ کیا وہ روایات جن کی بنا پر قتلِ مرتد کی ساری عمارت کھڑی کی گئی ہے قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف ہیں یا نہیں۔

اس کے بعد اس پر غور فرمایئے کہ ہم کیا کہتے ہیں اور مولوی صاحبان (اور ان کے نمائندہ مودودی صاحب) کیا کہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ایسی روایات جو قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہوں، قطعاً رسول اللہ کے ارشادات نہیں ہو سکتے اسلئے کہ ہمارے نزدیک اس امر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) رسول اللہ کوئی ایسی بات کہہ یا کر سکتے تھے جو قرآن کے خلاف ہو۔

لیکن اس کے برعکس مولوی صاحبان (اور ان کے ترجمان مودودی صاحب) کا ارشاد ہے کہ اسلام کی حقیقی تعلیم وہی ہے جو ان روایات کے اندر ہے۔

اس کے بعد خیال فرمایئے کہ ہمارا وہ کونسا جرم ہے جس کی پاداش میں ہمیں گردن زدنی اور کشتنی قرار دیا جا رہا ہے اور طلوعِ اسلام کے پیش کردہ مسلک کو دورِ حاضر کا سب سے بڑا فتنہ بتایا جاتا ہے؟

یہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد ذرا اس پر غور فرمایئے کہ اگر خدانکردہ ملک میں وہ "نظامِ شریعت" رائج ہو گیا جس کے قیام کیلئے مودودی صاحب اور ان کی جماعت کوشاں ہے اور اس طرح تنفیذِ امورِ شریعت کی آڑ میں زمامِ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی تو پاکستان میں بسنے والوں کا کیا حشر ہو گا اور دنیا کس قسم کے اسلام کا تماشا دیکھے گی۔ کیا یہ اسلام اسی روحِ فرعونیت کا "مقدس پیکر" نہیں ہو گا جو ہر اس شخص کے خلاف جو اس سے ذرا سا بھی اختلاف رکھے، یہ کہہ کر فتویٰ موت صادر کر دیتی تھی کہ

آمنتم بہ قبل ان آذن لکم۔ — کیا تم نے ہماری اجازت کے بغیر ہی اپنا مذہب تبدیل کر لیا (اور موسیٰؑ پر ایمان لے آئے)

اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لیجئے کہ "قتلِ مرتد" کا مطلب یہی نہیں کہ اگر ایک مسلمان مثلاً عیسائی ہو جائے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق "علماء حضرات" کہہ دیں کہ اس کے عقائد درست نہیں ہیں اور وہ اس طرح "کافر" ہو گیا ہے تو اسے بھی قتل کر دیا جائے گا۔ ہماری تاریخ میں ایسے واقعات بہت کم ملیں گے کہ کسی نے اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لیا ہو اور اسے قتل کر دیا گیا ہو۔ لیکن ایسے واقعات سے ساری تاریخ بھری پڑی ہے کہ جس شخص، یا فرقہ کے متعلق کہہ دیا گیا کہ اس کے عقائد درست نہیں، اس شخص یا فرقہ سے متعلق ہزاروں افراد کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ ہماری تاریخ میں اس حکم کا نفاذ عملاً ہوا ہی ان مسلمانوں پر ہے جو خدا، رسول، قرآن، آخرت وغیرہ سب باتوں کے قائل تھے۔ لیکن کسی جزئی سے مسئلہ میں علماء حضرات سے اختلاف رکھتے تھے، یہ صورتِ حالات کس قدر خطرناک ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ایک وضاحت

ہم آخر میں، ایک بار پھر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے اس بحث میں مودودی صاحب کا نام خاص طور پر اس لئے لیا ہے کہ انہوں نے "قتلِ مرتد" کے موضوع پر خاص طور پر کتاب شائع کی ہے۔ ورنہ ہمارے

تمام علمائے کرام ... کا یہی عقیدہ ہے کہ

(۱) جو شخص کسی چھوٹے سے چھوٹے عقیدہ میں بھی ان سے اختلاف رکھے وہ مرتد ہے۔ اور

(۲) مرتد کی سزا قتل ہے۔

اس لیے اس ضمن میں سوال، زید بکر یا عمر کا نہیں۔ اصل سوال اس غلط تصور کا ہے جو بد قسمتی سے ہمارے ہاں صدیوں سے مروج چلا آرہا ہے۔ جب تک اس غلط تصور کو قرآن کریم کے مطابق صحیح نہیں کر لیا جاتا، اصلاحِ حال کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یاد رکھیے، قرآن کریم دنیا میں فکر اور آرائے خیالات اور عقائد کی آزادی کا سب سے بڑا حامی ہے اور وہ اپنی کوئی بات کسی سے بہ جبر نہیں منوانا چاہتا۔ نہ وہ کسی کو زبردستی مسلمان کرنا چاہتا ہے، اور نہ وہ کسی کو اس پر مجبور کرتا ہے کہ اگر وہ کسی وجہ سے اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرنا چاہے تو وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ خیالات اور عقائد کی آزادی کو انسان کا بنیادی حق تسلیم کرتا ہے۔ "فمن شاء فلیومن و من شاء فلیکفر (جس کا جی چاہے ایمان لائے جس کا جی چاہے انکار کرے) اس کا بنیادی منشور ہے"

تبصرہ

مندرجہ بالا مضمون پر علامہ اسلم جیراجپوریؒ نے حسبِ ذیل تبصرہ ارقام فرمایا۔

> قتلِ مرتد پر مضمون بسیط اور مدلل ہے۔ مجھے بہت پسند آیا۔ امیر جماعت اسلامی کے قرآن سے قتلِ مرتد پر استدلال سے مجھے ان کی بے علمی پر سخت افسوس ہوا۔ یہ جماعت بس نیم ملاؤں کی ایک مذہبی بازی گری ہے۔ تعجب ہے کہ ان کی سمجھ میں "حکومتِ الٰہی" تو آتی ہے مگر "دینِ الٰہی" نہیں آتا۔

ہمارا خیال ہے کہ (سابقہ) اسلامی جماعت پر اس سے زیادہ جامع اور بلیغ تبصرہ شاید ہی ہو سکے۔ علامہ اسلم کی تحریر کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ سورج کی بکھری ہوئی شعاعوں کو سمٹا کر آتشیں شیشے کے مرکزی نقطہ سے گذار دیتے تھے۔ کس قدر مختصر لیکن جامع اور صحیح تھا ان کا یہ مطالعہ کہ

> اِن کی سمجھ میں حکومتِ الٰہی تو آتی ہے مگر
> دینِ الٰہی نہیں آتا!

قتلِ مرتد

(علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

[قتل مرتد کے متعلق مبسوط مقالہ طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ علامہ اسلم جیراجپوری کا زیر نظر مضمون رسالہ جامعہ ملی بابت اکتوبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا۔ ہم اس کا وہ حصہ حذف کر کے جس کا تعلق قادیانیت سے تھا، باقی مضمون شائع کرتے ہیں۔ طلوع اسلام]

جامعہ کے گزشتہ پرچہ میں کابل میں ایک مرزائی کے سنگسار کرنے کی بابت ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس پر ہمارے رسالہ کے بعض ناظرین نے اس مسئلہ کے متعلق ہمارا خیال دریافت کیا ہے۔ اس لئے ہم ضرورت سمجھتے ہیں کہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کردیں۔ اس کے لئے ہم کو سب سے پہلے قرآن مجید کو دیکھنا چاہئے کیونکہ وہی شریعت کا منبع اور اسلامی قوانین کا سرچشمہ ہے۔ قرآن نے نہایت صاف لفظوں میں یہ اصول مقرر کر دیا ہے کہ

لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ

دین میں کوئی زبردستی نہیں۔

ہر ہر فرد اپنی اپنی نجات کا ذمہ دار ہے اور اس کو کامل آزادی ہے کہ اپنا ذریعۂ نجات تلاش کرے۔ اس کی اس حریت کو غصب کرنیکا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اور اس معاملہ میں کسی قسم کا جبر نہیں ہو سکتا۔ خود مرتد کے متعلق سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَیَمُتْ وَھُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ۔

تم میں سے جو اپنے دین سے پلٹ جائیگا اور کفر کی حالت میں مرجائیگا تو یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت ہوئے۔

یہاں اللہ نے مرتد کا نتیجہ اور انجام بیان کر دیا لیکن اس کو قتل کردینے نہ حکم دیا نہ کسی کو یہ حق بخشا بلکہ اس کو اپنی موت سے مرنے کی مہلت دی۔ سورۂ مائدہ میں بھی ارتداد کا ذکر کیا اور وہاں بھی کوئی سزا نہیں بتائی۔

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ

مسلمانو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائیگا تو اللہ ایسے لوگوں کو لائیگا جن کو وہ دوست رکھتا ہوگا اور وہ اللہ کو دوست رکھتے ہونگے۔

سورۂ آل عمران میں فرمایا کہ کوئی مرتد ہو جایا کرے ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔

وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا

جو اُلٹے پیروں لوٹ جائیگا وہ اللہ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کو بھی کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ سورۂ مائدہ میں اس اصول کی تصریح کردی کہ کوئی گمراہ ہو جایا کرے تمہیں اس کی کیا پڑی ہے۔ تم صرف اپنے نفس کی خبر رکھو۔

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا عَلَیْکُمْ أَنفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَیْتُمْ

مسلمانو تم اپنے نفس کی فکر رکھو۔ جب تم راہ راست پر رہو گے تو جو گمراہ ہو جائیگا وہ تم کو ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

ایک نہیں ہزار مرتد ہو جائیں اللہ بے نیاز ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔

إِن تَکْفُرُوا أَنتُمْ وَمَن فِی الْأَرْضِ جَمِیعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِیٌّ حَمِیدٌ۔

اگر تم کافر ہو جاؤ اور وہ سب لوگ جو زمین پر ہیں پھر بھی اللہ بے نیاز اور سزاوار حمد ہے۔

سورۂ نساء میں ہے:۔

إِنَّ الَّذِینَ آمَنُوا ثُمَّ کَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ کَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللَّهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ سَبِیلًا

جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے گئے تو اللہ ایسا نہیں کہ ان کو بخشیگا نہ ان کو سیدھی راہ دکھائے گا۔

اس میں کسی سزا یا قتل کی اجازت مطلقاً نہیں دی ہے۔ اور اگر قتل کی سزا ہوتی تو ایک بار کافر ہونے کے بعد پھر ایمان اور پھر کفر کا موقع کہاں ملتا۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کریم جس نے قاتل کا قصاص، باغی، ڈاکو، چور، زناکار اور اس کے جھوٹے گواہوں کے حدود، یہاں تک کہ ظہار اور یمین کے کفارے بھی بیان کردیئے وہ مرتد کی اس عظیم الشان سزا یعنی قتل اور حال کے فتووں کے مطابق سنگساری کے ذکر سے کیوں خاموش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے دین کے معاملہ میں ہر شخص کو حریت کامل عطا فرمائی ہے اور کسی کے عقیدہ پر جبر کرنے کی مطلق اجازت نہیں دی ہے۔ کیونکہ دنیا میں یہی سب سے بڑا ظلم ہے۔ سورۂ یونس میں ہے:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّکَ لَآمَنَ مَن فِی الْأَرْضِ کُلُّهُمْ جَمِیعًا أَفَأَنتَ تُکْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ یَکُونُوا مُؤْمِنِینَ۔

جو تیرا رب چاہتا تو روئے زمین کے سارے آدمی ایمان لاتے۔ کیا لوگوں پر تو زبردستی کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں۔

سورۂ کہف میں نہایت بلند آہنگی سے اعلان ہے:

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّکُمْ فَمَن شَاءَ فَلْیُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْیَکْفُرْ۔

کہدے کہ تمہارے رب کی طرف سے حق آ چکا۔ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔

اسی مضمون کو سورۂ یونس میں اور زیادہ واضح کر دیا ہے۔

قُلْ یَا أَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَکُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّکُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا یَهْتَدِی لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا۔

کہدے کہ لوگو! تمہارے رب کی طرف سے حق آ چکا۔ جو ہدایت اختیار کریگا وہ اپنے لئے اور جو گمراہ ہوگا وہ اپنے لئے۔

قرآن کی تعلیمات سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اسی بات پر جہاد اور قتال کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ دینی عقیدے پر جبر

نہ ہونے دیں۔ سورۂ بقرہ اور انفال دونوں میں حکم موجود ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ

اور کافروں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو۔

فتنے کے معنی ہیں سونے یا چاندی کو آگ میں جلا کر کھرا کھوٹا الگ کرنا۔ مفردات میں راغب اصفہانی نے یہی معنی لکھے ہیں۔ اصطلاح شرع میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کو اس لئے ستانا کہ وہ اپنے عقیدے سے باز آجائے جیسے کفار مکہ مسلمانوں کو ستاتے تھے۔ یہ جبر قرآن کے نزدیک قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ اور عقیدے پر جبر قتل سے بھی سنگین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم ان کے ساتھ لڑو تاکہ اس قسم کا فتنہ باقی نہ رہے اور لوگ خالص اللہ کے لئے دین اختیار کریں نہ کہ کسی جبر کے خوف سے۔

اس لحاظ سے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس فتنۂ جبر کو دنیا سے مٹائیں نہ کہ الٹے خود ہی اس کو قائم کریں۔ اور قرآن جس بُت کے توڑنے کا حکم دیتا ہے اسی بت کو خود پوجنے لگیں۔ کیونکہ عقیدہ پر اگر جبر باقی رہا تو تبلیغ محال ہوگی۔ اس لئے کہ جملہ قومیں اور اہل مذاہب اپنے اپنے یہاں قتل مرتد کا قانون بنالیں گے پھر اس وقت کسی شخص کا کسی مذہب سے نکل کر دین حق میں داخل ہونا موت کے مرادف ہوگا۔ اور تبلیغ دین بغیر خونریزی کے اور کچھ نہ رہ جائے گی۔ اور اس کا سب سے زیادہ نقصان اسلام کو برداشت کرنا پڑے گا کیونکہ وہی سب سے بڑا تبلیغی دین ہے۔ جب قرآن کریم بالتصریح ہر شخص کو دین کے معاملہ میں آزادی دیتا ہے اور محض تبدیل مذہب پر کسی قسم کی دنیاوی سزا نہیں مقرر کرتا تو یقیناً احادیث صحیحہ اس کے خلاف نہیں جاسکتیں۔ ان میں جن لوگوں کے قتل کردینے کا حکم دیا گیا ہے وہ دراصل سیاسی مجرم ہیں نہ کہ دینی۔ بخاری شریف میں روایت ہے۔

من بدل دینه فاقتلوه

جو اپنا دین تبدیل کرے اس کو قتل کردو۔

ظاہر ہے کہ اس حدیث کو راوی نے مجمل اور مبہم بیان کیا ہے۔ اس سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو کافر مسلمان ہوجائے اس کو بھی قتل کردو۔ اس لئے یہ کسی قانون کی بنیاد نہیں ہوسکتی۔ اسی کتاب میں دوسری حدیث اس سے مفصل ہے۔

لا یحل دم امرا مسلم یشهد ان لا اله الا الله وانی رسول الله الا باحدی ثلث۔ النفس بالنفس۔ والثیب الزانی والمارق عن الدین التارك للجماعة

مرد مسلمان جو کلمۂ شہادت پڑھتا ہے اس کا خون حلال نہیں ہے بجز ان تین وجوہات کے۔ جان کے بدلے جان، شادی شدہ زناکار اور دین سے خارج ہونے والا جو جماعت کو چھوڑ دے۔

اب بحث یہ رہ جاتی ہے کہ مروق عن الدین اور ترک جماعت کا مفہوم اور اس کے حدود کی تعیین کیا ہے۔ مروق عن الدین خود بخاری ہی میں آنحضرتؐ سے خوارج کے متعلق منقول ہے جنھوں نے امت کے ساتھ جدال وقتال عام شروع کردی تھی اس لئے اس کا مفہوم بجز جماعت مسلمین سے بغاوت اور محاربہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا ہے۔

لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض

میرے بعد کفر کی طرف نہ پلٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔

یعنی ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کی گردن مارنا ہی کفر کی طرف لوٹنا اور ارتداد ہے۔ اس لئے مروق عن الدین اور تارک للجماعۃ سے بجز ان لوگوں کے جو جماعت مسلمین کے ساتھ آمادۂ قتال ہو جائیں اور کوئی مراد نہیں لیا جا سکتا۔ وہ خواہ دین سے مرتد ہوں یا پابند اسلام لیکن قتل کئے جائیں گے۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ خوارج اسلامی عقائد میں نہایت پختہ اور زہد و عبادت میں اقران سے فائق تھے لیکن باوجود اس کے خلفاء وقت ان سے جہاد کرتے رہے کیونکہ وہ محارب تھے۔ مگر جو شخص صرف دین کو چھوڑے نہ جنگ کرے نہ دنیا میں فساد پھیلائے وہ اس ذیل میں نہیں آ سکتا۔

صحاح میں جسقدر حدیثیں اس مضمون کی ہیں گو ان کے الفاظ رواۃ کی زبان سے مختلف ہو گئے ہیں لیکن مطلب ہر ایک کا یہی ہے دراصل یہ سب کی سب اس آیت کے ذیل میں آتی ہیں۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا الآیۃ

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے اور ملک میں فساد پھیلاتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ مار ڈالے جائیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے فتنۂ ردت میں جو جہاد کیا تھا وہ بھی اسی بنیاد پر تھی۔ کیونکہ مرتد قبائل جنگ کے لئے تیار اور مسلح ہو گئے تھے۔ اور بعض بعض نے حوالی مدینہ پر حملے بھی شروع کر دیئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلام کے مرکز کو توڑ دیں تاکہ ہم سے کوئی زکوٰۃ وصول کرنے والا نہ رہے ان کا جرم سراسر سیاسی تھا اور وہ اللہ اور رسول سے باغی اور محارب تھے اسلئے ان کے مقابلہ میں جہاد لازمی تھی۔

دوسرا امر بحث طلب مرتد کی تعریف ہے۔ مرتد دراصل صرف وہ شخص ہے جو خود اپنی زبان سے کہدے کہ میں نے دین اسلام کو چھوڑ دیا دوسرے کسی شخص یا کسی جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو کافر یا مرتد کہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو۔ قرآن میں ہے:

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا - الآیہ

جو تم کو سلام کرے اس سے یہ مت کہو کہ تو مومن نہیں ہے۔

ورنہ دنیا میں ایک مسلمان بھی مرتد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔ کیونکہ ہر ایک اسلامی فرقہ دوسرے مسلمان فرقوں کو گمراہ اور باطل پرست سمجھتا ہے ایسی حالت میں ہر مسلم بجز اپنی جماعت کے دوسروں کے نزدیک مرتد قرار پائے گا۔

غلام اور لونڈیاں

آپ کسی مسجد کے منبر سے صداقت و حقانیتِ اسلام پر وعظ سنئے یہ بلند آہنگ دعاوی ہمیشہ آپ کو سنائی دینگے کہ

اسلام نے مذہبی آزادی عطا کی۔

اسلام نے دنیا سے غلامی کا نام و نشان مٹایا۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے واعظین و مصلحین کے یہ دعوے بہت بڑی صداقت کے حامل ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ اتنے ہی بڑے جھوٹ پر مبنی ہیں۔ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ ہم نے اتنی بڑی متضاد باتیں کس طرح لکھ دیں؟ لیکن یہ تضاد فی الواقعہ موجود کر اور ہر سوچنے والے دماغ کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ لاریب فیہ کہ اسلام نے نوعِ انسانی کو مذہبی آزادی عطا کی اور اس نے دنیا سے غلامی کے نام و نشان کو مٹایا۔ اسلئے اسلام جتنی بڑی بلند آہنگی سے چاہے متذکرہ صدر دعاوی کو ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا کے سامنے پیش کرے اسے اس کا حق حاصل ہے اور اس باب میں نوعِ انسانی پر اس کا احسانِ عظیم ہے۔ لیکن کونسا اسلام؟ وہ اسلام جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ جسے ذات رسالتمآبؐ نے دنیا کو دیا اور جو آج بھی قرآن کی دفتین میں محفوظ و مصئون موجود ہے۔ یہ ہے ان دعاوی کی عظیم القدر صداقت کی سند۔ لیکن جس اسلام کو ہمارے اربابِ شریعت پیش کرتے ہیں اگر اس کی طرف سے یہ دعاوی پیش کئے جاتے ہیں تو یہ فی الواقعہ بہت بڑے جھوٹ پر مبنی ہیں اس لئے کہ اسلام نے نہ مذہبی آزادی عطا کی ہے نہ غلامی کو مٹایا ہے۔ اس اسلام نے مذہبی آزادی کا گلا کس طرح گھونٹا، اس کی تصویر آپ "قتلِ مرتد" کے مضمون میں دیکھ چکے ہیں (جو طلوعِ اسلام بابت مارچ ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکا ہے)۔ زیرِ نظر مقالہ میں یہ دیکھئے کہ غلامی کے بارے میں اُس اسلام کا کیا ارشاد ہے جسے عجمی سازشوں نے وضع کیا اور جسے مُلا، خدا اور اس کے رسول کی طرف منسوب کرکے، وجۂ ننگِ اسلام اور باعثِ تذلیلِ انسانیت بن رہا ہے۔

قرآنی اسلام کی تعلیم

پہلے یہ دیکھئے کہ قرآنی اسلام کی اس باب میں کیا تعلیم ہے۔ بعثتِ نبی اکرمؐ کے وقت، ملوکیت، پیشوائیت، سرمایہ داری، نسل پرستی اور قومیت کی طرح غلامی بھی دنیا میں ایک مسلّمہ کی حیثیت سے رائج تھی، مستبد بادشاہوں کو چھوڑیئے۔ مفکرینِ عالم کی یہ کیفیت تھی کہ ارسطو کے پاس ستر غلام تھے اور وہ غلامی کے جواز (بلکہ وجوب) میں ستر دلیلیں پیش کیا کرتا تھا۔ عرب میں غلام اور لونڈیاں ان کے معاشرے کا لاینفک جزو بن چکے تھے۔ باہر غلام کام کاج کرتے تھے اور گھروں میں لونڈیاں جنسی تمتع کے مصرف میں لائی جاتی تھیں۔ ان کے ہاں صدیوں سے یہی روش چلی آ رہی تھی اسلئے، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، غلام اور لونڈیاں ان کے معاشرے کا جزو بن چکے تھے اور ان کی معاشی زندگی کا بیشتر دارانحصار انہی پر تھا۔

قرآن ان اغلال و سلاسل کو توڑنے کیلئے آیا تھا جن میں نوعِ انسانی جکڑے چلی آرہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ غلامی جیسی بدترین لعنت کی زنجیروں کو کس طرح روا رکھ سکتا تھا۔ قرآن کا پیغام، شرفِ انسانیت کا پیغام اور اس کی دعوت، احترامِ آدمیت کی دعوت ہے۔ اس کے خدا کا اعلان ہے کہ ولقد کرمنا بنی آدم۔ ہم نے فرزندِ آدم کو مستحقِ تکریم بنایا ہے۔ یعنی انسان بہ حیثیت انسان واجب التکریم ہے۔ اس کا انسان ہونا اس کے لئے باعثِ شرف ہے اور یہ شرف و تکریم ہر فرزندِ آدم کیلئے ہے۔ تمام نوعِ انسانی کو "نفس واحدہ" سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور ہر انسان کے اندر "روحِ خداوندی" پھونکی گئی ہے۔ یعنی ہر انسان صفاتِ خداوندی کی ممکنات کا حامل ہے۔ اور قرآنی معاشرے کا مقصود و مطلوب فقط یہ ہے کہ ان ممکن صفات کو مشہود بنا کر ان کی کامل نشو و نما کر دے۔ انسان کے متعلق جس دین کی یہ بنیادی تعلیم ہو ظاہر ہے کہ اس میں انسانی غلامی کا تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کے سامنے دو اہم سوال تھے:

قرآن کے سامنے دو مراحل تھے

(۱) نزولِ قرآن کے وقت جو غلام اور لونڈیاں عربوں (اور دیگر ممالک) کی معاشرتی اور معاشی زندگی کا جزو بن چکے تھے، ان کیلئے کشود کی راہ۔ اور

(۲) آئندہ کیلئے اس دروازے کا بند کر دینا جہاں سے غلام اور لونڈیاں آتے تھے۔

شقِ اول کے متعلق ظاہر ہے کہ ان تمام غلاموں اور لونڈیوں کو ایک ہی دن میں نابود نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسلام کا منشا یہ تھا کہ انہیں آزاد کر کے باقی انسانوں کے ہم پہلو کھڑا کر دے لیکن اُن معاشرتی اور معاشی حالات میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، یہ مقصد بتدریج حاصل ہو سکتا تھا۔ اگر ان تمام غلاموں اور لونڈیوں کو (جو اس وقت موجود تھے) آنِ واحد میں آزاد کر کے چھوڑ دیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ وہاں کے معاشرے میں سخت انتشار واقع ہو جاتا بلکہ خود ان غلاموں اور لونڈیوں کیلئے بھی عجیب مشکلات کا سامنا ہوتا اور اکثر و بیشتر حالات میں وہ ان خاندانوں کو چھوڑنا ہی نہ چاہتے جن میں وہ گھل مل چکے تھے۔ قرآن نے ان کے متعلق ایسا طریقِ عمل اختیار کیا جس سے وہ آہستہ آہستہ اس آزاد معاشرہ میں جذب ہوتے چلے گئے۔ انہیں حق دیدیا گیا کہ وہ چاہیں تو کچھ فدیہ ادا کر کے پروانۂ آزادی حاصل کر لیں۔ کہیں خود مسلمانوں کو تاکید کر دی کہ وہ بعض کوتاہیوں کے کفارے کے طور پر غلاموں کو آزاد کر دیں۔ اسی طرح لونڈیوں کو آہستہ آہستہ آزاد عورتوں کا سا درجہ دیدیا۔ جب تک یہ غلام اور لونڈیاں بتدریج جذب نہیں ہو گئے ان سے حسنِ سلوک کا حکم دیا تاکہ وہ انسانی مراعات سے محروم نہ رہنے پائیں۔ قرآن کریم میں غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق جس قدر احکام ہیں وہ سب، انہی کی بابت ہیں جو اس وقت اس معاشرے میں، لونڈی اور غلاموں کی حیثیت سے موجود تھے۔ قرآن میں جہاں جہاں ان کا ذکر ہے ان الفاظ میں ہے کہ "ماملکت ایمانکم" جو (بطور غلام اور لونڈی) تمہاری ملکیت میں آ چکے ہیں۔ کہیں یہ نہیں کہ "جنہیں تم اس کے بعد لونڈی اور غلام بناؤ"۔ یہ تو ہوا شقِ اول کے متعلق۔ یعنی ان لونڈیوں اور غلاموں کے متعلق جو ظہورِ اسلام کے وقت عربوں کے معاشرے میں موجود تھے۔

آئندہ کیلئے دروازہ بند

اب رہی شقِ دوم۔ یعنی آئندہ کیلئے غلامی کا دروازہ بند کرنا سو اس کے لئے قرآن نے ایسی فصاحت سے حکم دیدیا کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ (اور قرآن کا کونسا حکم ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ بشرطیکہ اسے خالی الذہن ہو کر دیکھا جائے۔ یہ تو ہمارے روایاتی رنگین شیشے ہیں جو اس کی صاف اور شفاف

تعلیم کو بھی رنگدار بنا دیتے ہیں ۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مے بے دُردو صاف رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

ایام جاہلیت میں غلام اور لونڈیاں جنگ کے قیدیوں کو بنایا جاتا تھا اور بعد میں انھیں فروخت بھی کر دیا جاتا تھا ۔ (بعض اوقات بچوں کو چرا کر بھی فروخت کیا جاتا تھا لیکن غلاموں اور لونڈیوں کا اصل سرچشمہ جنگ کے قیدی ہی تھا) ۔ جنگ کے قیدیوں کو کیا کیا جائے اس کے متعلق سورۂ محمد میں ہے :

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰىٓ اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۔

جب تمہارا مقابلہ کفار سے ہو تو انھیں تہ تیغ کرو ۔ یہاں تک کہ جب ان میں مقابلے کی طاقت باقی نہ رہے (ان کا زور ٹوٹ جائے) تو بقیۃ السیف لوگوں کو باندھ لو ۔

یہ ہوئے اسیرانِ جنگ ۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان اسیرانِ جنگ کو

فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (۴۷)

یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر ۔

سارے قرآن میں اسیرانِ جنگ سے متعلق یہی ایک حکم ہے ۔ آپ اس حکم کو دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ اس میں کہیں کسی پہلو سے بھی انھیں غلام بنانے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے ۔ یا اس قسم کا گمان بھی گذر سکتا ہے کہ قرآن کا منشا یہ ہے کہ اسیرانِ جنگ کو غلام بناؤ ۔ ان کی عورتوں سے جنسی تمتع کرو ۔ پھر جی چاہے تو انھیں بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کر دو ۔ فروخت ہونے کے بعد وہ نئے خریدار کے غلام بن جائیں اور لونڈیاں اس کے مصرف میں آنے لگ جائیں ۔ اور قیامت تک ، جب تک ان کے مالک انھیں آزاد نہ کر دیں ، وہ نسلاً بعد نسلٍ غلام اور ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم رکھے جائیں ۔ غلام کا بیٹا بھی غلام رہے اور ساری عمر ایک پیسے کا مالک نہ ہو سکے (خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو جائے) ۔ ذرا سوچئے کہ آیۂ مذکورہ بالا سے کسی صورت میں بھی یہ حکم نکل سکتا ہے ؟ قرآن کا حکم بالکل صاف ہے ۔ دشمن سے جنگ ہو تو اس صورت میں اسیرانِ جنگ تمہارے قبضے میں آئیں گے ۔ یہ جنگ کے قیدی ہوں گے ۔ جب تک جنگی مصالح کا تقاضا ہو گا یہ قید میں رکھے جائیں گے ۔ اس کے بعد ان کی (DISPOSAL) کا سوال سامنے آئے گا ۔ اس لئے قرآن نے دو متبادل صورتیں (ALTERNATIVES) بیان کر دیں ۔ یعنی یا فدیہ لیکر (جس میں اپنے قیدیوں کا تبادلہ بھی شامل ہے) یا بطور احسان ، ان قیدیوں کو رہا کر دیا جائے ۔ قرآن نے نہ انھیں قتل کرنے کا حکم دیا ہے نہ غلام بنانے کا ۔ لیکن ملا کی شریعت کہتی ہے کہ نہیں ! خدا کا یہ حکم نامکمل ہے ۔

ملا کا مذہب

اس کی تکمیل اس اسلام سے ہوتی ہے جسے میں پیش کرتا ہوں ۔ اور وہ حکم یہ ہے کہ جو لوگ جنگ میں قیدیوں ان کو یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے ۔ یا فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے یا دشمن کے مسلمان قیدیوں سے ان کا مبادلہ کر لیا جائے ۔ لیکن اگر یونہی رہا کر دینا جنگی مصالح کے خلاف ہو اور فدیہ وصول نہ ہو سکے اور دشمن اسیرانِ جنگ کا مبادلہ کرنے پر بھی راضی نہ ہو تو مسلمانوں کو حق ہے کہ انھیں غلام بنا کر رکھیں ۔ (تفہیمات حصہ دوم از ابوالاعلیٰ صاحب مودودی صفحہ ۲۹۳)

مودودی صاحب اپنی تفسیر (تفہیم القرآن) میں اس سے بھی زیادہ وضاحت سے لکھتے ہیں کہ یہ بات حکومت کے اختیار میں ہے کہ جو صورت چاہے اختیار کرے:

حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) رہا کر دے۔ چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے تو انھیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انھیں اپنے استعمال میں لائیں (ص۳۲)

یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم تو صرف اس قدر ہے کہ "فاما منا بعد واما فداء" اسیران جنگ کو بطور احسان رہا کر دو یا فدیہ و معاوضہ لیکر لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ (معاذ اللہ) خدا کا یہ حکم ناقص ہے۔ پورا حکم یوں ہے کہ اسیران جنگ کو چاہے بطور احسان رہا کرو، چاہے فدیہ لیکر چھوڑ دو۔ اور چاہے انھیں غلام بنا کر رکھو اور ان کی عورتوں کو اپنے مصرف میں لاؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ مُلا کے پورے مذہب کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ خدا کا کوئی حکم مکمل نہیں ہوتا۔ اس کی تکمیل دوسرے مقامات سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب اس باب میں صاف صاف لکھتے ہیں کہ

مولف[ف] کی غلطی کا اصلی سبب یہ ہے کہ انھوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

(تفہیمات حصہ دوم ص۲۹۲)

اس میں کیا شبہ ہے؟ ایک مسلمان کی اس سے بڑی "غلطی" اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ قرآن کو مکمل ضابطۂ حیات سمجھتا ہے اور زندگی کے قانون اس سے اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے! یہ "غلطی" ہی نہیں مُلا کی عدالت میں ایسا جرم عظیم ہے جس کی پاداش میں ایسے مسلمان کو مرتد قرار دیکر حوالۂ دار و رسن کیا جا سکتا ہے! مسلمان اور یہ کوشش کہ صرف قرآن سے قانون اخذ کر لیا جائے! توبہ۔ توبہ۔ کتنا بڑا بہتان ہے خدا کے خلاف، اور کتنی بڑی جسارت ہے قرآن کے خلاف!! معلوم ایسے مسلمان خدا کے سامنے جا کر کیا جواب دینگے جب وہ ان سے پوچھے گا کہ کیا تم نے میری اس کتاب کو مکمل ضابطۂ قانون سمجھ لیا تھا؟ کیا تم نے میرے متعلق ایسا گمان کیا تھا کہ میں مکمل احکام دے سکتا ہوں؟ کیا تم نے میری اس بات کو فی الواقعہ سچ سمجھ لیا تھا کہ

وتمت کلمت ربك صدقا وعدلا۔ لامبدل لکلمتہ (۶/۱۱۶)

"تیرے رب کے قوانین صدق اور عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئے۔ ان قوانین خداوندی کو کوئی بدل نہیں سکتا۔"

کیا تمہیں اسرار شریعت کے حامل (مُلا) بار بار نہیں کہتے تھے کہ خدا کے احکام ناقص ہیں اور اپنی تکمیل کے لئے غیر خداوندی اضافوں کے محتاج ہیں۔ تم اپنی ضد پر اڑے رہے اور ان کی ایک نہ مانی۔ اب کہو تمہارے پاس کیا جواب ہے؟

مُلا کے ذہن میں خدا کا کچھ ایسا ہی نقشہ ہے۔

تضاد بیان | مودودی صاحب نے یہ کچھ تو حافظ اسلم جیراجپوری صاحب کے جواب میں لکھا لیکن جب کسی نے براہ راست ان سے

[ف] مولف سے مراد ہیں علامہ اسلم جیراجپوری مرحوم کی تالیف "تعلیمات قرآن" پر تنقید کے سلسلے میں مودودی صاحب نے یہ بحث چھیڑی تھی کہ اسلام میں غلامی کا حکم موجود ہے اور مولف کی یہ سخت غلطی ہے جو لکھتے ہیں کہ اسلام نے غلامی کو منسوخ کر دیا ہے۔

دریافت کیا کہ "لونڈیوں سے بلانکاح تمتع شہوت زانی ہے اور اسلام اس کے خلاف ہے" تو آپ نے تحریر فرمایا کہ
ان سوالات کے جواب میں پہلے یہ جان لینا چاہیئے کہ حقِ ملکیت کی بنا پر تمتع کی اجازت قرآن مجید کی متعدد آیات میں صریح
طور پر وارد ہوئی ہے۔ بہت سے لوگ اس معاملہ میں بڑی بے باکی کے ساتھ یہ سمجھتے ہوئے اعتراضات کر ڈالتے ہیں کہ یہ شاید "مولویوں"
کا گھڑا ہوا مسئلہ ہوگا۔ اور بعض منکرین حدیث اس کو اپنے نزدیک "حدیث کے خرافات" میں سے سمجھ کر زبان درازی کرنے لگتے ہیں۔
لہذا ایسے سب لوگوں کو آگاہ رہنا چاہیئے کہ ان کا معاملہ "مولویوں" کی فقہ اور محدثین کی روایات سے نہیں بلکہ خود خدا کی کتاب
سے ہے۔ (ایضاً ص۳۱)

آپ پہلے اس بیان کو دیکھئے جس میں مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ "مولف کی غلطی کا اصل سبب یہ ہے کہ انھوں نے صرف قرآن سے
غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش کی ہے" اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ مولوی کا من گھڑت مسئلہ نہیں۔ خود قرآن
کا حکم ہے۔ آپ غور فرمائیے کہ کتنا بڑا کھیل ہے جو دین کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے۔ یعنی جب مصلحت سمجھی یہ کہہ دیا کہ دین، قرآن ہی کے
اندر تھوڑا ہے۔ اس کے ساتھ فقہ اور روایات بھی ضروری ہیں۔ اور جب ضرورت دیکھی یہ کہہ دیا کہ ہم فقہ اور روایات سے سند نہیں
لاتے۔ ہم قرآن پیش کرتے ہیں۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے قرآن سے وہ آیات نقل کر دی ہیں جو ان غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں جو نزولِ قرآن کے
وقت موجود تھے اور جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

علامہ اسلم صاحب نے اسیرانِ جنگ کے متعلق قرآن کی آیت نقل کر کے لکھا تھا کہ اس سے قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت
کہیں نہیں نکلتی۔ آیت اور اس کا ترجمہ یہ تھا۔

فاما منا بعد واما فداء   پھر یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لیکر

اس ترجمہ کے متعلق مودودی صاحب فرماتے ہیں:

اس کے بعد لفظ منّ قابل غور ہے۔ منّ کے معنی صرف احسان کے ہیں۔ "احسان رکھ کر چھوڑ دو"
مترجم کا اپنا اضافہ ہے۔ (ص۳۰)

لیکن مودودی صاحب خود ہی دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ

اسلام کا قانون یہ قرار پایا کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوں ان کو یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے۔ . . . . (ص۲۹)

اور دوسری جگہ

اسلام نے دنیا کے سامنے یہ اصول پیش کیا کہ جو لوگ جنگ میں قید ہوں ان کو فدیہ لیکر چھوڑ دو۔ یا اسیرانِ جنگ سے
مبادلہ کر لو۔ یا بطریقِ احسان رہا کر دو۔ (ص۳۱)

یعنی اگر حافظ اسلم صاحب یہ کہیں کہ "احسان رکھ کر چھوڑ دو" تو یہ ان کا اپنا اضافہ ہے۔ اسلام کا قانون نہیں ہے۔ اور جب مودودی صاحب ارشاد فرمائیں کہ "احسان کے طور پر رہا کر دو" تو یہ اسلام کا قانون ہے ان کا اپنا اضافہ نہیں ہے۔

جب میں چلوں تو سایہ بھی میرا نہ ساتھ دے — جب تم چلو، زمین چلے، آسمان چلے!

قرآن میں احسان کا حکم کہیں نہیں

اس ضمن میں ایک اور چیز بھی بڑی دلچسپ سامنے آتی ہے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

آیت میں منّا کا لفظ ہے جس کے معنی احسان رکھنے کے ہیں اور قرآن میں احسان کا حکم کہیں نہیں دیا گیا۔ (ص۲۹۳)

غور فرمایا آپ نے کہ ملا اپنی بات کی پچ میں کہاں تک جا پہنچتا ہے؟ فرماتے ہیں کہ قرآن میں احسان کا حکم کہیں نہیں دیا گیا۔ یہ اس قرآن کا ذکر ہے جس میں یہ آیت بھی موجود ہے کہ

ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان (۱۶/۹۰)

یقیناً اللہ تمہیں عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ اللہ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ ورنہ جس ملا کی جرأتوں کا یہ عالم ہے کہ وہ قرآن میں ایسے احکام کی موجودگی میں کہہ دیتا ہے کہ "قرآن میں احسان کا حکم کہیں نہیں دیا گیا" اگر قرآن کہیں اسی کی تحویل میں ہوتا تو معلوم یہ اس کے ساتھ کیا کچھ کرتا!

اس بے بسی میں ذوقؔ یہ عالم بشر کا ہے — کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے!

دنیا اس مسئلے کا حل کس طرح کرتی ہے؟

مودودی صاحب بار بار یہ فرماتے ہیں کہ اگر فریق مخالف اپنے قیدیوں کو چھڑائے نہیں۔ اور قیدیوں میں زرِ فدیہ دے کر آزاد ہونے کی استطاعت نہ ہو تو اس صورت میں ان قیدیوں کو کیا کیا جائے! لیکن ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انھیں غلام بنا لیا جائے اور ان کی عورتوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا جائے۔ دنیا میں آئے دن جنگیں ہوتی ہیں۔ ان میں قیدی بھی پکڑے جاتے ہیں۔ ان قیدیوں سے متعلق مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ خود ہماری آنکھوں کے سامنے دو مہیب اور عظیم جنگیں ہو چکی ہیں جن میں قیدیوں کی مجموعی تعداد کروڑوں تک پہنچ چکی تھی۔ کیا ان قوموں میں سے کسی کا ذہن بھی اس طرف گیا کہ ان قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر نخاس میں ٹکے ٹکے پر فروخت کرنا چاہئے؟ ان کفار اور مشرکین کا ذہن تو اس طرف نہ گیا لیکن یہ ہمارے مفتیانِ شریعت ہیں (جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا نظامِ زندگی 'انسانوں کا وضع کردہ نہیں' خود خدا کا عطا فرمودہ ہے۔ اور اس کی مثل اور نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی) جب ان کے سامنے یہی سوال آتا ہے تو انھیں اس کے سوا کوئی عملی شکل نظر ہی نہیں آتی کہ ان قیدیوں کو غلام بنا کر فروخت کیا جائے! اور

ان کی عورتوں کو اپنے استعمال میں لایا جائے۔

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!

قرآن اس مسئلہ کا حل صاف بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک تمہارے مصالح کا تقاضا ہو ان قیدیوں کو قیدیوں کی طرح رکھو۔ اور چونکہ یہ قیدی انسان ہیں اسلئے ان سے انسانیت کا سلوک کرو۔ اس کے بعد جب ان کے آزاد کرنے کا سوال سامنے آئے تو تمہیں اجازت ہے کہ ان کے مبادلے میں اپنے قیدی چھڑا لو۔ یا اگر فریقِ مخالف کے ہاں تمہارے قیدی نہ ہوں (یا کم مقدار میں ہوں) تو زرِ فدیہ لیکر آزاد کردو۔ اور یہ بھی اجازت ہے کہ انہیں بطور احسان چھوڑ دو۔ جو صورت مناسب نظر آئے اس کے مطابق عمل کرو۔ حتیٰ تضع الحرب اوزارھا (۴۷) یہاں تک کہ خود جنگ اپنے ہتھیار رکھدے۔ یعنی تمہارا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ دنیا سے جنگ کا سلسلہ ختم ہوجائے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ تم جنگ کے قیدیوں کے ساتھ ایسا سلوک کرو کہ آئندہ وہ تمہارے خلاف ہتھیار ہی نہ اٹھائیں۔ اور مخالف قوموں سے اس قسم کا احسان مندانہ سلوک کرو کہ تمہارے سامنے ان کا سرِ تسلیم خود ہی خم ہوجائے۔ یہ تھا قرآن کا منشار۔ لیکن ہمارے ملا کا مذہب یہ ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام بناؤ اور ان کی عورتوں سے شہوت رانی کرو تاکہ دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہوجائے۔

بالکل درست فرمایا۔ جن لوگوں سے اس قسم کا سلوک ہوگا وہ آئندہ دشمنی پر آمادہ ہی نہیں ہو سکیں گے؟ وہ تو ایسی قوم کے بے دام غلام بن جائیں گے!

چونکہ غلامی کا تصور ہی ایسا ہے کہ اس سے انسان کے احساسِ انسانیت کو ٹھیس لگتی ہے (بشرطیکہ یہ احساس اندھی تقلید کے افیونی اثر سے مفلوج یا مصلحت کوشیوں سے مجوب نہ ہوچکا ہو) اس لئے مودودی صاحب کے پاس اس کے خلاف بہت سے اعتراضات پہنچے۔ ان اعتراضات کو دیکھکر مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

> جنگ میں گرفتار ہونے والے سپاہیاں (لونڈی غلاموں) کے حق میں اسلام نے جو قوانین وضع کئے تھے ان کو سمجھنے میں آج لوگوں کو اسلئے دقتیں پیش آرہی ہیں کہ اس زمانے میں وہ حالات باقی نہیں رہے جن کیلئے یہ قوانین وضع کئے گئے تھے۔ (ص ۳۰۹)

اس اقتباس سے بظاہر ایسا مترشح ہوتا ہے کہ مودودی صاحب بھی وہی بات کہتے ہیں جسے ہم نے شروع میں پیش کیا ہے یعنی یہ کہ قرآن میں "ما ملکت ایمانکم" (لونڈی غلاموں) کے متعلق جو احکام ہیں وہ ان لونڈیوں اور غلاموں کی بابت میں جو اس وقت عربی معاشرے میں موجود تھے۔ جب وہ غلام باقی نہ رہے تو یہ احکام بھی ختم ہوگئے۔ (البتہ اس کے بعد اگر پھر کوئی ایسی صورت پیدا ہوجائے۔ یعنی کوئی ایسی قوم اسلام لے آئے جس میں پہلے سے لونڈی غلام موجود ہوں۔ یا خود مسلمانوں کی وہ سلطنتیں جن میں لونڈی اور غلاموں کو روا رکھا گیا تھا یا آج بھی روا رکھا جاتا ہے۔ مثلاً حجاز کی "مقدس" سرزمین اور وہاں کی "خالص اسلامی" حکومت میں ــــ پھر قرآن کی طرف رجوع کریں تو اس وقت پھر وہی احکام نافذ العمل ہوجائیں گے جو زمانۂ بعثتِ نبی اکرمؐ میں نافذ ہوتے تھے) لیکن درحقیقت مودودی صاحب یہ احکام اب بھی موجود ہیں اس سے بالکل مختلف بات کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آج بھی جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی

عورتوں کو لونڈیاں بنایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ تشکیلِ پاکستان کے بعد جب مودودی صاحب نظامِ شریعت کی "تنفیذ" کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان سے (۱۹۴۸ء میں) پوچھا گیا کہ

کیا نظامِ شریعت میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانے کی اجازت ہوگی۔ اور کیا اُن غلام اور لونڈیوں کو فروخت کرنے کا بھی حق ہوگا۔ (ص۳۳۱)

تو انھوں نے کہا کہ ہاں! نظامِ شریعت میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے وہ حالات بتائے جن میں جنگی قیدی غلام بنائے جاسکتے ہیں اور وہ "دلائل" دیئے جن کی رو سے (مودودی صاحب کے نزدیک) یہ احکام عین مبنی بر حکمت ہیں۔ اگر کسی کو شک ہو تو وہ مودودی صاحب سے پھر دریافت کرلے کہ جس نظامِ شریعت کو وہ رائج کرنا چاہتے ہیں اس میں جنگی قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنانے کی اجازت ہوگی یا نہیں۔ ان کی تفسیر (تفہیم القرآن) حال میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں جنگ میں قید شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنا کر سپاہیوں میں تقسیم کرنے کا حکم مستقلاً موجود ہے۔ (اقتباس اوپر دیا جاچکا ہے تفصیل جس کا جی چاہے وہاں دیکھ لے) اور یہ اس لئے کہ از منۂ سلفی کے شاہی درباروں میں وضع شدہ شریعت میں وہ معاشرہ کس کام کا جس میں لونڈیاں ہی نہ ہوں!

اب وہ دلائل ملاحظہ فرمائیے جن کی رو سے غلامی کو عین مطابق حکمتِ الٰہیہ قرار دیا جا رہا ہے۔ فرماتے ہیں:

غلامی کے حق میں دلائل

نظامِ شریعت میں جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانے کی اجازت ایسی حالت میں دی گئی ہے[1] جب کہ وہ قوم جس سے ہماری جنگ ہو نہ قیدیوں کے تبادلے پر راضی ہو نہ فدیہ لیکر ہمارے قیدیوں کو چھوڑے اور نہ فدیہ دیکر اپنے قیدی چھڑالے۔ آپ غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں جو قیدی کسی حکومت کے پاس رہ جائیں وہ یا تو انھیں قتل کرے گی یا انھیں عمر بھر اس قسم کے انسانی باڑوں میں رکھے گی جنھیں آج کل (CONCENTRATION CAMPS) کہا جاتا ہے اور کسی قسم کے انسانی حقوق دیئے بغیر ان سے جبری محنت لیتی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت زیادہ بے رحمانہ ہے۔ . . . . اسلام نے ایسے حالات کے لئے جو شکل اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ ان قیدیوں کو فرداً فرداً مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کی ایک قانونی حیثیت مشخص کر دی جائے۔ (ص۳۳۲)

سوال یہ نہیں کہ "کوئی حکومت" ان حالات میں جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ سوال یہ ہے کہ نظامِ شریعتِ اسلامیہ کی حامل حکومت ان حالات میں کیا کرے گی۔ کیا ان کے ہاں بھی اس قسم کے (concentration camps) ہوں گے جن میں قیدیوں کو کسی قسم کے انسانی حقوق دیئے بغیر ان سے جبری محنت لی جائیگی؟ کیا اس نظامِ شریعت میں انسانوں کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرنے کی کوئی پابندی نہیں ہوگی؟ کیا اس میں قیدیوں کو "شاہی مہمان" (state guests) کی صورت میں رکھنے کی کوئی اجازت نہیں ہوگی؟ کیا وہ نظام ایسا ہی ہوگا کہ اس میں جنگی قیدی شکر کریں گے کہ انھیں غلام بنا لیا گیا ہے ورنہ نہ جانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس نظامِ شریعت میں انسانوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک روا رکھا جائے گا کہ اس سلوک کے

---

[1] اس سے بھی ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک یہ اجازت آج بھی موجود ہے اگر وہ حالات پیدا ہو جائیں جن کا انھوں نے ذکر کیا ہے۔ طلوعِ اسلام۔

مقابلے میں غلامی گویا ان کے حق میں بہت بڑا احسان ہوگی! کیا یہی ہوگا وہ نظام شریعت جس کے متعلق ہم ساری دنیا کو کہتے چلے آرہے ہیں کہ وہ عرش سے اُترا ہوا ہے؟

پھر یہ دیکھئے کہ بجائے اس کے کہ ہم ان (concentration camps) کی اصلاح کا کوئی طریقہ سوچیں اور دنیا سے کہیں کہ جنگی قیدیوں سے انسانوں جیسا سلوک کرو، ہم ان سے کہتے ہیں تو یہ کہ "اسلام" نے اس خرابی کا یہ حل بتایا ہے کہ ان کے مردوں کو غلام بنالیا جائے اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں؟ سبحان اللہ! کیسی "آسمان سے نازل شدہ" اصلاح ہے! انسانیت اس حسنِ سلوک پر ناز کرے گی اور دنیا کے قیدی اس احسانِ عظیم پر سجدہ ریز ہوں گے جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے کہ ان کی بیویاں، بیٹیاں، بہنیں، ان "مصلحین و مشفقین" کی ہوس رانیوں اور عیش جوئیوں کا شکار بن رہی ہیں۔ وہ شکر کریں گے کہ ان سے جبری محنت نہیں لی جارہی۔ . . . . صرف ان سے جبری . . . . کیا جارہا ہے؟

مودودی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ غلام بنانے سے ان کی قانونی حیثیت مشخص ہو جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ قانونی حیثیت کیا ہے؟

(i) غلام اپنی کمائی کے ایک پیسے کا بھی مالک نہیں بن سکتا۔

(ii) غلام کا بیٹا بھی غلام ہوتا ہے (حتیٰ کہ اگر غیر مسلم غلام مسلمان بھی ہو جائے وہ تب بھی غلام ہی رہتا ہے)

(iii) جب مالک کا جی چاہے اُسے، جس کے ہاتھوں جی چاہے فروخت کردیا جاسکتا ہے۔

(iv) غلام عورت (یعنی لونڈی) سے بلانکاح جنسی تعلقات قائم کئے جاتے ہیں۔ اس میں تعداد کا بھی کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔

(v) جس لونڈی سے اس طرح جنسی تمتع کیا جائے، اس کا درجہ "شریف بیبیوں" جیسا نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس کی اولاد پر بھی پرستارزادگی کا داغ رہتا ہے۔

(vi) لونڈیوں کے ساتھ ہم بستری کی صورت میں عزل (withdrawal) بھی کیا جاسکتا ہے اور لواطت بھی (اس کی تفصیل اور سند آگے آتی ہے)

(vii) اور جب جی بھر جائے تو لونڈی کو کسی دوسرے کے پاس فروخت بھی کیا جاسکتا ہے۔

دیکھ لیا آپ نے کہ کتنی بڑی ہے یہ قانونی حیثیت جو غلاموں اور لونڈیوں کو عطا فرمائی جارہی ہے!

عورتوں پر احسانِ عظیم

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کیلئے . . . . اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو عورت حکومت کی طرف سے جس شخص کی ملکیت میں دی جائے اس کے ساتھ اس شخص کو جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دیدیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلانے کا ایک مستقل ذریعہ بن جائیں۔ (ص۳۲۳)

یعنی اگر کسی معاشرے میں ایک ایک شخص، دس دس بیس بیس عورتیں سنبھال لے۔ ان کے ساتھ، ان کی مرضی کے خلاف، جنسی تعلقات قائم کرلے۔ پھر جب جی چاہے انھیں کسی دوسرے کی طرف منتقل کردے اور اس کی قیمت بھی اپنی ہی جیب میں ڈالے۔ تو یہ سب کچھ، ماشاء اللہ پاکیزگی اخلاق میں داخل ہے۔ اور اگر ان عورتوں کو اس طرح آپس میں تقسیم بانٹا جائے اور پھر اس طرح ان کی خرید و فروخت کی جائے تو وہ سوسائٹی میں "مستقل بداخلاقی" پھیلانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ ہر وہ بداخلاقی جسے ملا کی بارگاہ سے جواز کا فتویٰ مل جائے، عین اخلاق ہے۔ اس کے سوا "اخلاق" اور "بداخلاقی" کی تعریف (definition) اور کیا باقی رہ جاتی ہے! چنانچہ اس کی مزید تشریح خود مودودی صاحب نے کردی ہے۔ ان پر اعتراض یہ کیا گیا کہ

لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع محض شہوت رانی ہے اور اسلام اس کے خلاف ہے۔ (ص ۳۰۷)

نکاح کی ضرورت نہیں

اعتراض سن لیا، اب جواب ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

اس میں بظاہر جو کراہت نظر آتی ہے وہ محض ایک وہمی کراہت ہے۔ چونکہ طبیعتیں نکاح کے عام اور معروف طریقے کی خوگر ہو چکی ہیں اس لئے لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت اور مرد کا صرف وہی تعلق جائز ہے جس میں قاضی صاحب آئیں۔ دو گواہ ہوں۔ ایجاب و قبول ہو۔ خطبۂ نکاح پڑھا جائے۔ اس کے سوا جو صورت ہے وہ محض شہوت رانی ہے۔ لیکن اسلام کوئی رسمی (CONVENTIONAL) مذہب نہیں بلکہ ایک عقلی (RATIONAL) مذہب ہے۔ وہ رسم کو نہیں حقیقت کو دیکھتا ہے۔ نکاح سے ایک عورت جو ایک مرد کیلئے حلال ہوتی ہے تو آخر اسی بنا پر تو حلال ہوتی ہے کہ اللہ کے قانون نے اسے حلال کیا ہے۔ اسی طرح اگر ملک یمین کی بنا پر اللہ کا قانون اسے حلال کرے تو اس میں کراہت کی کونسی بات ہے۔ (ص ۳۱۵)۔

یعنی! معترض صاحب لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع پر ہی چیں بجبیں ہو رہے تھے، مودودی صاحب کے نزدیک اصلاً نکاح ہی غیر ضروری ہے لونڈیوں کی بات تو بعد میں آئے گی۔ اس سے ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔

زید کسی ایسی عورت سے، جس سے قرآن کی رو سے نکاح کیا جا سکتا ہے، عورت کی مرضی سے، تعلقات زناشوئی قائم کرتا ہے۔ وہ دونوں باہمی رضامندی سے اسی طرح رہتے ہیں لیکن نکاح نہیں کرتے۔

سوال یہ ہے کہ کیا شریعت کی رو سے ان کا یہ جنسی تعلق جائز ہوگا یا ناجائز۔ اور ان کی اولاد، حلال کی اولاد قرار پائیگی یا حرام کی۔

مودودی صاحب کے نزدیک یہ تعلقات بالکل جائز ہیں۔ جو لوگ اس قسم کے تعلق (بلا نکاح) کو شرعاً ناجائز سمجھتے ہوں وہ مودودی صاحب سے خود بات صاف کرلیں۔ ہم تو سردست لونڈیوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے لہٰذا اپنی بات کو انہی تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ جنسی حلت و حرمت کے متعلق یہ سمجھ لینا نہایت ضروری ہے کہ ہر وہ عورت جسے خدا نے حلال کردیا ہے از خود حلال نہیں ہو جاتی۔ اس کیلئے ایک اہم شرط اور بھی ہے۔ اور وہ شرط اسی طرح لاینفک ہے جس طرح خدا کی طرف سے حلت کی شرط۔ اور یہ شرط ہے خود عورت کی رضامندی۔ مثلاً خدا نے زید پر اس کے چچا کی لڑکی حلال قرار دی ہے۔ (یعنی قرآن کی رو سے زید کا نکاح اس کی چچیری بہن سے ہو سکتا ہے) لیکن یہ لڑکی محض خدا کے حلال قرار دینے سے زید کے لئے حلال نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے خود اس لڑکی کی رضامندی (کہ وہ زید کی

بیوی بنا چاہتی ہے) بھی لاینفک ہے۔ اگر وہ لڑکی اس پر رضامند نہیں ہوتی تو وہ (خدا کے حلال کرنے کے باوجود) زید پر حرام ہی رہے گی۔ لہذا جنسی تعلقات کے جائز ہونے کے لئے دو شرطیں لاینفک ہیں۔

[1] اول —— اس عورت کو خدا نے حلال قرار دیا ہو۔ اور
دوم —— وہ عورت، تعلقاتِ زناشوئی پر رضامند ہو۔

اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو تو وہ تعلقات حرام ہوں گے اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اگر عورت رضامند نہ ہو تو خدا کی حلال کردہ بھی حلال نہیں ہوتی۔

اب یہ سوچئے کہ کیا لونڈی سے تعلقات کی صورت میں یہ دوسری شرط پوری ہوتی ہے؟ کیا لونڈی سے اس کی رضامندی کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کئے جاتے ہیں؟ (ظاہر ہے کہ اس میں اس کی رضامندی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ جس کے حصے میں آجائے اور جس کے ہاتھوں فروخت ہو جائے لُٹے اس سے بہر حال ہم بستر ہونا پڑے گا۔

اب آپ غور فرمائیے کہ دنیا کا کوئی ضابطۂ اخلاق بھی ایسا ہے جو اس قسم کے تعلقات کو جائز قرار دیدے؟ خدا کے ضابطۂ قوانین کو تو چھوڑئیے، کیا یورپ کے ملحدین، کفار اور مشرکین کے ہاں بھی اس قسم کے جنسی تعلقات کو جائز قرار دیا گیا ہے؟ ان تعلقات کو تو ان لوگوں کے ہاں بھی زنا (RAPE) ہی قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن قیامت ہے کہ ایسے تعلقات کو اگر روا رکھا جاتا ہے تو اس دین کے (نام نہاد) پیروؤں کے ہاں جو دنیا میں مکارمِ اخلاق کا بلند ترین ضامن اور عصمت و عفت کا حصن حصین واقعہ ہوا ہے۔ اور قیامت بالائے قیامت کہ اس زبردستی کے جنسی تعلقات کی اجازت کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذات رسالتمآبؐ کی طرف جو دنیا میں پاکیزگی اخلاق، عفتِ نگاہ اور تطہیرِ فکر و عمل کے سب سے بڑے معلم اور علمبردار تھے! اب اس کے بعد سوائے اس کے کہ انسان اپنا سر پیٹ کر بیٹھ جائے اور کیا کر سکتا ہے۔ غور کیجئے کہ عجم کی ان سازشوں نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا رکھا ہے۔ یعنی وہ باتیں جنھیں ملحدین و مشرکین کے ہاں بھی شرمناک تصور کیا جاتا ہے، وہ ہمارے "مذہب" کا جزو بنا کر رکھدی گئی ہیں اور انھیں خدا اور رسول کی طرف منسوب کیا جاتا ہے!

کوئی حد مقرر نہیں!

اب آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب کے سامنے جب یہ اعتراض پیش کیا گیا کہ

اسلامی شریعت میں نکاح کیلئے تو چار کی حد مقرر ہے۔ . . . . لیکن لونڈیوں کے لئے سرے سے کوئی حد رکھی ہی نہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اجازت نے چار کی حد مقرر کرنے کے سارے فوائد کو باطل کر دیا۔ اس نے خوشحال

---

[1] معروف شرطیں تین ہیں،
(۱) خدا نے اس عورت کو حلال قرار دیا ہو۔
(۲) مرد اور عورت کی باہمی رضامندی ہو۔ اور
(۳) اور اس رضامندی کا اظہار نکاح کی رو سے کیا جائے۔
چونکہ تیسری شرط کو خود مودودی صاحب نے غیر ضروری قرار دیدیا ہے اس لئے ہم ان سے صرف پہلی دو شرطوں کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

لوگوں کیلئے بے تحاشا عیاشی کا دروازہ کھول دیا اور امراء و رؤسا کیلئے یہ گنجائش نکال دی کہ بے شمار عورتوں کو خرید کر گھروں میں ڈال لیں اور خوب داد عیش دیں۔ یہ کچھ مفروضہ ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی پچھلی تاریخ میں عملاً یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ (ص ۳۱۹)

تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ

لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کی قید اسلئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آسکتی ہیں بالفرض اگر ایسی عورتوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو جائے تو اس سوسائٹی میں انہیں کھپانے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ جبکہ لونڈیوں سے تمتع کیلئے تعداد کا تعین پہلے ہی کر دیا گیا ہو۔ (ص ۳۲۴)

لیکن اگر آپ سے کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ منکوحہ عورتوں کی صورت میں آپ کے ہاں چار تک کی تعداد متعین ہے۔ اور اس کا جواز بھی آپ یہی پیش کرتے ہیں کہ جب عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جائے تو اس طرح انہیں سوسائٹی میں کھپایا جا سکتا ہے، لیکن اگر ایسا ہو جائے کہ سوسائٹی میں عورتوں کی تعداد بہت بڑھ جائے تو اس صورت میں آپ کیا کریں گے؟ آپ کی مذکورہ صدر دلیل سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ منکوحہ عورتوں کے باب میں اللہ نے جو آخری حد مقرر کر دی ہے، اس میں (معاذ اللہ) دوراندیشی سے کام نہیں لیا گیا۔ وہ دوراندیشی پر مبنی تو لونڈیوں کا قانون ہے جس میں لونڈیوں کی تعداد کی کوئی حد متعین نہیں کی گئی بلکہ اصول یہ رکھا گیا ہے کہ

جو ہو چمن میں وفور گل کا، تو اور دامن دراز ہو جا۔

اور اگر (بقول مودودی صاحب) لونڈیوں سے متعلق قانون بھی خدا ہی کا بنایا ہوا ہے تو یہ عجیب چیز ہے کہ منکوحہ بیویوں کی صورت میں تو اس کا خیال نہ رکھا گیا کہ اگر عورتوں کی تعداد اس سے بھی بڑھ گئی تو کیا کیا جائیگا، اور لونڈیوں کے معاملے میں اس کا خاص خیال رکھا گیا؟

ذہنی آوارگی

انسان اپنی ہوس کاریوں کیلئے بھی کیسے کیسے مقدس بہانے تراشتا ہے!! اس کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں؛

رہا آپ کا یہ شبہ کہ لونڈیوں کی ان گنت تعداد سے تمتع کرنے کی اجازت ذہنی آوارگی کا دروازہ کھولتی ہے اور یہ کہ لونڈیوں کے قابل بیع و شری ہونے کی وجہ سے اس کا امکان ہے کہ مالدار لوگ لونڈیاں خرید خرید کر ایک پورا بیڑہ فراہم کر لیں اور اپنے گھروں کو عیاشی کا اڈا بنا کر رکھ دیں۔ تو یہ اور اس نوعیت کے اکثر شبہات عموماً اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ معاملہ کا ایک ہی پہلو نگاہ کے سامنے ہوتا ہے اور دوسرے پہلو چھپے رہتے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ شارع نے اپنا قانون انسانی بھلائی کیلئے بنایا ہے اور اس قانون میں جو سہولتیں اور گنجائشیں رکھی ہیں وہ ان حقیقی ضرورتوں کیلئے رکھی ہیں جو عموماً انسان کو پیش آتی ہیں یا پیش آسکتی ہیں۔ اگر بعض لوگ ان گنجائشوں سے اس قسم کے غلط فائدے اٹھاتے ہیں جن کیلئے درحقیقت شارع نے یہ گنجائشیں نہیں رکھی تھیں تو یہ ان کی اپنی نافہمی ہے یا شرارت نفس لیکن اس قسم کی انفرادی غلطیوں کے امکان یا وقوع کے ڈر کر قانون میں ایسی تنگی پیدا کرنا جس سے عام لوگوں کی حقیقی ضرورتیں پوری ہونے میں مشکلات واقع ہوں کسی حکیم کا کام نہیں ہو سکتا۔ (ص ۳۲۵)

اسی ضمن میں آپ دوسری جگہ لکھتے ہیں:

بعد کے زمانے میں امراء و رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنایا وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشاء کے خلاف تھا۔ (ص ۳۲۸)

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب قوم میں لونڈیاں دھڑا دھڑ آ رہی ہوں۔ ان کی تعداد کی بھی کوئی حد مقرر نہ ہو۔ وہ ایک دوسرے کی طرف منتقل بھی کی جا سکتی ہوں تو پھر وہ کونسی "عیاشی" ہے جسے آپ شریعت کی منشاء کے خلاف کہہ سکتے ہیں۔ جسے لونڈی مل جائے (خواہ حکومت کی طرف سے یا قیمتاً) اور "شریعت" اس سے

جنسی تعلقات کی اجازت دیتی ہو۔ تو پھر اس لونڈی سے تمتع، عیاشی کا حیلہ کسطرح بن جائیگا۔ عیاشی کے سامان تو خود فراہم کردیئے جائیں اور پھر ان سے مستفید ہونے والوں پر الزام دھرا جائے۔ موردِ الزام اس سامان عیاشی کو فراہم کرنے والے ہیں یا ان سے متمتع ہونے والے؟ اس ضمن میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

> کوئی رئیس اگر عیاشی کرنا چاہے اور قانون کے منشا کے خلاف قانون کی گنجائشوں سے فائدہ اٹھانے پر اتر آئے تو نکاح کا ضابطہ ہی کب اس کے لئے رکاوٹ بن سکتا ہے۔ وہ روزانہ ایک نئی عورت سے نکاح کرسکتا ہے اور دوسرے دن اسے طلاق دے سکتا ہے (ص ۳۲۲)

یہ صورت تھی اسی "شریعت" کی رو سے ممکن ہے جو ملّا کی خود ساختہ ہے۔ قرآنی شریعت میں طلاق دیدینا ایسا کھیل نہیں کہ نیلام کنندہ کی طرح ایک، دو، تین کہا اور بیوی کو ٹھوکر مار کر نکال دیا۔ قرآنی طلاق کے لئے کئی مراحل طے کرنے کے بعد عدالت سے فیصلہ لینا ہوگا۔ اس میں یہ مذاق نہیں ہوگا کہ گھر بیٹھے ہی طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہا اور معاملہ ختم کردیا۔

لونڈیوں کا فروخت کرنا اس کے بعد مودودی صاحب اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ لونڈیوں کو فروخت کرنا نہایت ذلت آمیز فعل ہے۔ فرماتے ہیں۔

> اس قسم کے لونڈی غلاموں کے بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے . . . . فدیہ وصول کرنے، اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لیکر دوسرے شخص کی طرف منتقل کردیتا ہے۔ قانون میں یہ گنجائش جس مصلحت سے رکھی گئی ہے اس کو آپ پوری طرح اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جبکہ کسی دشمن فوج کے سپاہی کو بطور قیدی رکھنے کا آپ کو اتفاق ہوا ہو۔ فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا بھی کوئی کھیل نہیں۔ اگر کسی شخص کے لئے یہ گنجائش نہ چھوڑی جاتی کہ جس قیدی مرد یا عورت سے وہ عہدہ برآ نہ ہو سکے اس کے حقوق ملکیت کسی دوسرے کی طرف منتقل کردے تو یہ لوگ جس کے بھی حوالے کئے جاتے اس کے حق میں بلائے جان بن جاتے (ص ۳۲۳)

سرت گردم! کیا دلیل ہے!! یعنی دشمن کے قیدیوں سے کام لینا بہت مشکل ہے۔ اور ان کی عورتوں کا گھروں میں رکھنا بیحد پُرخطر لیکن انہی قیدیوں کو جب غلام بنا لیا جائے تو پھر یہ مشکل آسان ہوجاتی ہے۔ اور جب ان کی عورتوں سے ان کے مردوں کے سامنے، ان کی مرضی کے خلاف جنسی تعلقات قائم کئے جائیں تو اس سے وہ تمام خطرات دور ہوجاتے ہیں جو دشمن قوم کے افراد ہونے کی وجہ سے ان کی طرف سے پیش آسکتے تھے۔ اس سے فی الواقعہ ان کے جذبات عداوت محبت میں بدل جائیں گے۔

اب رہا یہ کہ جب یہ غلام اور لونڈیاں کسی ایک کے لئے وبال جان بن جائیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ انہیں دوسرے کے ہاتھ فروخت کردیا جائے۔ تو یہ فروخت کردہ غلام اور لونڈیاں اپنے نئے مالک کے لئے واقعی عین راحت بن جائیں گے؟ اس سے انہیں دلی اُنس پیدا ہوجائیگا! اور اسی طرح جب وہ انہیں تیسرے کے ہاتھ فروخت کردیگا تو اس نئے مالک سے اور بھی زیادہ محبت ہوجائیگی! ان کی دشمنی تو دراصل پہلے ہی سے تھی جس نے انہیں مفت حاصل کرلیا تھا۔ جنہوں نے دام دیکر خریدا ہو ان سے دشمنی کرتے ہوئے انہیں شرم نہیں آئیگی؟

اگر غیر مسلم بھی یہی کریں تو؟

اب آئیے اس اعتراض کی طرف کہ غیر مسلم محارب قومیں اگر گرفتار شدہ مسلمان عورتوں کے ساتھ یہی سلوک کریں تو عقلاً اس کے خلاف مسلمانوں کو احتجاج کا کیا حق ہے (صفحہ ۳)

اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

رہا آپ کا آخری سوال، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال کرتے وقت آپ نے یہ فرض کر لیا تھا کہ دشمن کے قبضے میں جو مسلمان عورتیں جاتی ہونگی ان کو وہ بالکل گھر کی بیٹیاں بنا کر رکھتے ہونگے۔ کیا آپ کا یہ مفروضہ صحیح ہے؟ اور آپ کا یہ کہنا کہ اس پر ہمیں احتجاج کا کیا حق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم تو عورتوں ہی کو نہیں مردوں کو بھی غلام بنا کر رکھنا نہ چاہتے تھے۔ اگر دشمن اسیرانِ جنگ کے تبادلے پر راضی ہوتے تو ہم ان کے ایک مرد یا ایک عورت کو بھی اپنے پاس غلام بنا کر رکھنے پر اصرار نہ کرتے۔ لہذا اگر صدیوں تک دنیا میں غلامی کا رواج رہا اور ایک قوم کی شریف عورتیں لونڈیاں بن بن کر دوسری قوموں کے تصرف میں آتی رہیں تو یہ ہمارے قصور کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس کے ذمے دار وہ لوگ تھے جو صدیوں تک اسیران جنگ کے بارے میں کسی مہذب اور معقول رویّے کو اختیار کرنے پر راضی نہ ہوئے (ص ۱۹-۱۸)

یہ عبارت کچھ مبہم سی ہے۔ لیکن اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب دوسری قومیں ہماری عورتوں کو لونڈیاں بنائینگے تو ہم اُن کی عورتوں کو لونڈیاں کیوں نہ بنائیں! یعنی اسلام کے اپنے اصول کچھ نہیں۔ جو کچھ دوسرے ان سے کریں یہ وہی کچھ ان سے کرلیں۔ بس یہ ہے اصول۔ وہ ان کے ہاں ڈاکے ڈالیں تو اس کے جواب میں یہ بھی ان کے ہاں ڈاکے ڈالنا شروع کردیں۔ وہ ان سے جھوٹ بولیں تو یہ بھی ان سے جھوٹ بولیں۔ وہ ان سے بے ایمانی (بددیانتی) کریں تو اس کے جواب میں یہ بھی ان سے بے ایمانی شروع کردیں۔ وہ ان کی رہ چلتی عورتوں کو چھیڑیں یا اٹھالیں تو یہ بھی ان کی عورتوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کردیں اور انہیں زبردستی اٹھالیں۔ وہ ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنائیں تو یہ بھی ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنالیں! یہ ہوگا مسلمانوں کا اصولِ زندگی اور مسلکِ حیات۔ یہ ہوگا ان کا نمونہ دوسری قوموں کے ساتھ معاملات کے بارے میں! کیسے زرّیں ہیں یہ اصول اور کسقدر بلند ہے یہ مسلک۔ ایسی قوم کا مسلک و مشرب بتایا جارہا ہے جس کا خدا ان سے کہتا ہے کہ ان مشرکین کے بتوں کو بھی گالی نہ دو مبادا یہ بھی تمہارے خدا کو گالی دیدیں۔ جس کا قرآن ان سے کہتا ہے کہ لایجرمنکم شنأن قوم علی ان لاتعدلوا۔ اعدلوا۔ کسی قوم سے تمہاری دشمنی تمہیں کہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ تم ان سے بہرحال اور بہرکیف عدل کرو۔ عدل و انصاف کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ وہ اگر ذلیل حرکات پر اتر آئیں تو تم اپنا بلند مقام چھوڑ کر ان کی پست سطح پر نہ آجاؤ۔ تمہیں تو شاھدٌ علی الناس پیدا کیا گیا ہے۔ تمہیں ساری دنیا کے لئے مکارمِ اخلاق اور حسنِ آئین کا نمونہ بننا ہے۔ اگر تم بھی جوشِ انتقام میں انہی جیسی بیہودہ حرکتیں کرنے لگ گئے تو ان میں اور تم میں فرق کیا رہا!!

معترض کا اعتراض

لیکن معترض کا اعتراض ہنوز اپنی جگہ پر ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ آج اقوامِ عالم میں کسی کے یہاں بھی یہ قانون نہیں کہ جنگ کے قیدیوں میں عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کرکے ان کی خرید و فروخت شروع کردی جائے

لیکن (مودودی صاحب کے کہنے کے مطابق) اسلامی شریعت میں یہ شق موجود ہے۔ اب اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ کسی جنگ میں مسلمانوں کی عورتیں دشمن کے ہاں قید ہوں اور ان کی عورتیں مسلمانوں کے ہاں۔ دشمن اپنے قیدیوں کا مبادلہ نہ کرے نہ ہی زر فدیہ دیکر انہیں چھڑائے۔ تو ایسے حالات میں (مودودی صاحب کی شریعت کے مطابق) مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ وہ ان قیدی عورتوں سے جنسی تعلقات قایم کریں۔ معترض کا کہنا یہ ہے کہ ان حالات میں اگر دشمن (مسلمانوں کی طرف سے پہل ہونے کے بعد جیسے وہ اپنی "شریعت" کے مطابق کرینگے) مسلمانوں کی عورتوں سے بھی اس قسم کی حرکت کرنے لگ جائے تو اس صورت میں مسلمانوں کو یہ حق تو نہیں ہوگا کہ وہ دشمن کے اس رویے کے خلاف احتجاج کرسکیں۔ مودودی صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا حالانکہ (مودودی صاحب کے انداز فکر اور پیش کردہ مسلک کے مطابق) اس کا جواب واضح تھا کہ اسلام کے قوانین عالمگیر ہیں۔ اور مسلمانوں کی تمام جدوجہد کا ماحصل یہ ہونا چاہئے کہ اسلام کے قوانین ہر جگہ عام ہو جائیں۔ اگر کوئی قوم وہی قانون اپنے ہاں نافذ کرتی ہے جو مسلمانوں کے نظام شریعت میں موجود ہے تو یہ بات مسلمانوں کے لئے باعث مسرت اور وجہ صد افتخار ہوگی۔ لہذا اگر دنیا کی کوئی قوم (مسلمانوں کی طرف سے پہل ہونیکے بعد) ان کی قیدی عورتوں سے اس قسم کی نازیبا حرکت شروع کردیگی، تو مودودی صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات کے لئے یہ مقام ہزار مسرت و شادمانی کا ہوگا۔ کہ ان کے خدا کا قانون عام ہو رہا ہے اور دنیا کی قومیں (مسلمان ہونے بغیر) اسلام قوانین پر عمل پیرا ہوتی جا رہی ہیں۔ بلکہ وہ اسی کو اسلام کے "دین فطرت" ہونے کی ایک دلیل قرار دینگے کہ دیکھو! دنیا نے اسقدر جدوجہد کے بعد غلامی کو مٹایا تھا۔ لیکن چونکہ غلامی" انسانی فطرت" کا تقاضا تھی اس لئے ان قوموں کو دوبارہ اس کی طرف لوٹنا پڑا۔ " خدا" اپنے " دین " کو اس طرح انسانوں سے منواتا ہے! کیسا دلکش ہوگا وہ نظارہ کہ مسلمان، دشمن کی عورتوں سے زبردستی شب بسر کو رہے ہونگے اور دشمن ان کی بہو بیٹیوں کے ساتھ یہ کچھ کر رہا ہوگا۔ اور مسلمانوں کے ہاں خوشی کے شادیانے بج رہے ہونگے کہ خدا کا دین عام ہو رہا ہے۔ اس وقت ابلیس بوریہ بستر باندھکر اللہ کے ہاں یہ کہہ چلا جائیگا کہ اب زمین پر میری ضرورت باقی نہیں رہی۔ میرا مقصد تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔

مودودی صاحب نے لونڈیوں پر بڑا احسان یہ ظاہر فرمایا کہ

> مالک کے تصرف میں آجانے کے بعد ایک عورت اگر صاحب اولاد ہو جائے تو وہ اس خاندان کی ایک فرد بن جاتی ہے، اسکو ام ولد کہا جاتا ہے۔ اسکی اولاد جائز اولاد سمجھی جاتی ہے۔ اور اپنے باپ سے شرعی ورثہ پاتی ہے۔ (صفحہ ۳۱۵)

لیکن کسی اور کو شاید معلوم ہو یا نہ ہو، خود مودودی صاحب کو تو یقیناً معلوم ہوگا کہ "ان کی شریعت" نے یہ تدبیر بھی خود ہی بتادی ہے کہ لونڈیوں سے جنسی تعلقات قایم کئے جائیں اور یہ خدشہ بھی نہ ہے کہ ان کے ہاں اولاد پیدا ہو جائیگی۔ سنئے کہ وہ تدبیر کیا ہے؟

کلیجہ تھام لیجئے! لیکن اس تدبیر کے سننے سے پہلے، ہمارے درد بھرے دل کی ایک کراہ سن لیجئے۔ طلوع اسلام پر وہ وقت انتہائی کرب اذیت کا ہوتا ہے جب اسے کوئی ایسی بات درج کرنی پڑ جائے جسے دنیا کے سامنے پیش کرنے سے نگاہیں زمین میں گڑ جائیں۔ جس سے دوسروں کی نظروں میں اسلام کی سبکی ہو۔ پھر اس سے بھی زیادہ رنج و الم کا وقت وہ ہوتا ہے جب اس قسم کی

باتوں کو "حدیث" کہہ کر درج کیا جائے، کیونکہ حدیث سے مراد یہ ہے کہ اس بات کی نسبت ذاتِ رسالتمآبؐ کی طرف کی جاتی ہے۔ حضور ختمی مرتبتؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کا مقام اس قدر بلند ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اسے "خلقِ عظیم" کہہ کر پکارتا ہے اور حضورؐ کے ذکر کو بلند کرنے کا اعلان کرتا ہے (ورفعنا لک ذکرک) اس لئے طلوعِ اسلام کے صفحات میں کسی ایسی بات کا درج ہونا جس سے اس ذاتِ گرامی (فداہ ابی و امی) کی شان میں ذرا سا بھی طعن پایا جائے، ہمارے لئے قیامت کا حادثہ ہوتا ہے۔ لیکن ہم کیا کریں کہ بعض وقت صورت ایسی واقعہ ہو جاتی ہے کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا۔ مثلاً اسی غلامی کے موضوع کو لیجئے۔ اگر ہم اس مقام پر فقط اتنا کہہ کر آگے گذر جائیں کہ ہماری کتب روایات میں ایسی ایسی شرمناک باتیں موجود ہیں جن کے تصور سے پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے، تو مُلّا فوراً اعلان کر دیگا کہ "طلوعِ اسلام بکواس کرتا ہے۔ نبی اکرمؐ کی احادیث مقدسہ اور ان میں اس قسم کی باتیں (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ۔ اس دریدہ دہن کو شرم نہیں آتی کہ ایسے ایسے اتہامات تراشتا ہے اور پھر انہیں پوری بے حیائی سے حضور رسالتمآبؐ کی طرف منسوب کرتا ہے"۔ چونکہ عوام ان کتب روایات کی حدیثوں سے بے خبر ہوتے ہیں اور یہ بات بھی بڑی معقول نظر آتی ہے کہ ایسی مقدس کتابوں میں اس قسم کی بے حیائی کی باتیں نہیں ہو سکتیں، اس لئے مُلّا کا یہ حربہ کارگر ہو جاتا ہے۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ سینے پر پتھر رکھ کر، اس قسم کی مثالیں انہی مقدس کتب روایات سے درج کر دیں تاکہ پڑھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ ان میں فی الواقعہ یہ کچھ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طلوعِ اسلام نے مُلّا کے مذہب کی مخالفت ہی اس لئے شروع کر رکھی ہے کہ اس مذہب سے دنیا میں مسلمان رسوا ہو رہے ہیں — اسلام سخت بدنام ہو رہا ہے۔ اقوامِ عالم میں مسلمانوں کے اسلاف ہدفِ طعن و تشنیع بن رہے ہیں۔ خود حضور رسالتمآبؐ کی اس قسم کی تصویر سامنے آتی ہے جس سے (معاذ اللہ معاذ اللہ) انسان کا خون کھولنے لگ جاتا ہے، اور اس سے بھی آگے، خود خدا کا تصور ایسا قائم ہوتا ہے جو انسان کے دورِ جہالت و بربریت کا پیداوار دکھائی دیتا ہے۔ اگر کبھی طلوعِ اسلام کے صفحات پر اس قسم کی روایات نقل کر دی جاتی ہیں جو قارئین کے ذوقِ لطیف پر گراں گزرتی ہیں تو محض اس لئے کہ ان کے درج کئے بغیر یہ بات کبھی سمجھ میں ہی نہیں آسکتی کہ جس مذہب کو مُلّا اسلام کے نام سے پیش کرتا ہے کیا وہ فی الواقعہ ایسا ہے جیسا طلوعِ اسلام کہتا ہے؟

یہ ہے وہ ضرورت جس کی وجہ سے طلوعِ اسلام کو بعض اوقات اس تلخ اور ناگوار فریضہ کو سرانجام دینا پڑتا ہے۔ مُلّا کہتا ہے کہ طلوعِ اسلام کو اس "گند اچھالنے" میں مزہ ملتا ہے۔ ہم اس کی آنکھوں میں وہ بینائی کہاں سے لاکر رکھ دیں جس سے وہ دیکھ سکے کہ ہمارا سینہ کتنے کتنے بڑے گہرے زخموں سے چھلنی ہو رہا ہے۔ اگر اسے کہیں اس قسم کی بینائی نصیب ہو جائے تو وہ پھر دیکھ سکے کہ ہم کیا کہتے ہیں اور کیوں ایسا کہتے ہیں۔

کیا جانے کیا کہتا، کیا دیکھتا کیا کرتا زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں

اس عرضداشت کو سامنے رکھ کر اب اصل موضوع کی طرف آیئے۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ خود مُلّا کی شریعت نے اس کی بھی تدبیر کر دی ہے

صحیح بخاری کی روایات

کہ لونڈیوں کے ساتھ جنسی تعلقات بھی قائم ہوں اور اولاد کا خطرہ بھی پیدا نہ ہو۔ ہماری طرح چھاتی پر پتھر رکھئے اور سنئے وہ تدبیر! اور اس کے بعد دیوارِ حرم سے ٹکر مار کر سر پھوڑ کر مر جایئے۔ "صحیح" بخاری

کتاب البیوع۔ مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۱۵ پر یہ حدیث درج ہے:

ان اباسعید الخدری اخبرہ انہ بینما ھو جالس عند رسول اللہ۔ قال یا رسول اللہ انا نصیب سبیا۔ فنحب الاثمان فکیف تری فی العزل۔ فقال اوانکم تفعلون ذالك لا علیکم ان لا تفعلوا ذالکم فانھا لیست نسمۃ کتب اللہ ان تخرج الا ھی خارجۃ

ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک روز جبکہ رسول اللہؐ کے پاس بیٹھے تھے حضورؐ سے عرض کیا کہ ہم قیدی عورتوں کے ساتھ جماع کرتے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ وہ حاملہ نہ ہوں کیونکہ ہم انھیں بیچنا چاہتے ہیں۔ تو عزل[1] کرنے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

آپ نے فرمایا کہ کیا تم ایسا کرتے ہو۔ تم پر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ جو بچہ پیدا ہونا اللہ نے مقرر کیا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گا۔

ذرا سوچا بھی آپ نے کہ یہ نقشہ کس مجلس کا کھینچا گیا ہے؟ صحابہ کبارؓ استفسار کر رہے ہیں اور حضور نبی اکرمؐ جواب دے رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ خود ہی اندازہ فرمالیجئے کہ عجم کے منافقین نے کس کس طریق سے ہمیں تباہ و برباد کیا ہے۔ یہ ہے وہ تصویر جو انھوں نے آپ کے رسول مقبول اور ان کے صحابہ کبار کی کھینچ رکھی ہے۔ اور یہ تصویر آج اس کتاب میں موجود ہے جسے "ملا" قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ کہہ کر پیش کرتا ہے۔ عزل سے متعلق مذکورہ بالا گفتگو محض نظری حیثیت سے نہیں ہوئی بلکہ اسی بخاری (کتاب النکاح۔ باب العزل۔ جلد سوم صفحہ ۱۹۲) میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ

قال کنا نعزل علی عھد النبی والقران ینزل

ہم عہد نبوی میں عزل کیا کرتے تھے اور قرآن نازل ہوا کرتا تھا۔

یہ تھی وہ تدبیر جو (ملا کے مذہب کے مطابق) اس مقصد کے لئے اختیار کی جاتی تھی کہ لونڈیوں کو حمل نہ قرار پا جائے تاکہ اس طرح ان کی قیمت کم نہ ہونے پائے۔

اور اگر اس پر بھی حمل ہو جائے۔ یا وہ پہلے سے حاملہ ہو تو پھر مباشرت کی کیا صورت ہو؟ اس کے لئے اسی بخاری (جلد دوم صفحہ ۱۵) میں یہ حدیث بھی موجود ہے۔

لا بأس ان یصیب من جاریتہ الحامل مادون الفرج

اس میں بھی حرج نہیں کہ اپنی حاملہ لونڈی سے شرمگاہ کے علاوہ دوسری جگہ سے مجامعت کرلی جائے۔

معاذ اللہ! معاذ اللہ!! یہ ہیں وہ "احادیث مقدسہ" جنھیں حضور ختمی مرتبتؐ کی ذات گرامی اور صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور نہیں شرمایا جاتا کہ کل قیامت کو خدا اور اس کے رسول کے سامنے کیا جواب دینگے۔

یہ ہیں وہ روایات جن کا انکار کرنے سے ہمیں منکر حدیث قرار دیا جاتا ہے۔ ہم قارئین سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا آپ اس کی جرأت کر سکتے ہیں کہ ان روایات کے متعلق تسلیم کریں کہ واقعی نبی اکرمؐ یا حضور کے صحابہ کی سچی احادیث ہیں؟

---

[1] عزل کے معنی ہیں مجامعت کے وقت رحم کے اندر انزال نہ ہونے دینا۔

یہ ہے مختصراً غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق مسلک اس نظامِ شریعت کا جسے محترم مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا، پاکستان میں نافذ کرنے کے لئے سرگرمِ عمل ہیں۔ آپ سوچئے کہ اگر پاکستان میں وہ قوانین نافذ ہو گئے جنہیں یہ حضرات "اسلامی قوانین" قرار دیں، تو یہاں کس قسم کا معاشرہ قائم ہو گا اور دنیا کی دوسری قوموں میں آپ کی پوزیشن کیا قرار پائے گی؟ ہم یہ سوال اہلِ پاکستان سے کرنا چاہتے ہیں جو ذرا بھی پاکستان کی عزت کا خیال اور اسلام کا درد رکھتا ہے: اس بات پر غور کیجئے اور پھر سوچیے کہ طلوعِ اسلام جو ان باتوں کی مخالفت کرتا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے اور یہ حضرات جو اسے کافر اور بے دین قرار دیتے ہیں تو اسے کس جرم کی بنا پر ایسا کرتے ہیں! سوچئے کہ ان باتوں کا تعلق آپ سے بھی ہے۔ اس لئے کہ بالآخر آپ نے اور آپ کی آنے والی نسلوں نے بھی اسی ملک میں رہنا ہے:۔

جائزہ

سابقہ صفحات میں دو اہم عنوان آپ کے سامنے آئے ہیں۔ ایک قتلِ مرتد، اور دوسرا، غلام اور لونڈیاں۔ یہ دونوں عنوان ایسے ہیں جن کا انسانی ہیئتِ اجتماعیہ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ان کے متعلق قرآن کریم کی واضح تعلیم بھی آپ کے سامنے آچکی ہے، اور ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ جو کچھ کہتا ہے، وہ بھی آپ دیکھ چکے ہیں۔ آپ ان تصریحات پر غور فرمایئے اور پھر خود ہی فیصلہ کیجئے کہ جو کچھ شریعت کے نام سے ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے، وہ کبھی خدا کا فرمان اور اس کے سچے رسولؐ کا عمل ہو سکتا ہے؟ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ ان باتوں کی تائید ہماری کتبِ روایات سے ہوتی ہے، اس لئے یہ شریعتِ اسلامی کے عین مطابق ہیں۔ اس کے برعکس ہمارا موقف یہ ہے کہ

(۱) قرآن کریم خدا کی کتاب ہے اور حرفاً حرفاً اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

(۲) اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔

(۳) حضورؐ کا کوئی ارشاد یا عمل قرآن کریم کے خلاف ہو نہیں سکتا۔

(۴) کتبِ روایات، نبی اکرمؐ کی وفات کے دو تین سو سال بعد، لوگوں کی انفرادی کوششوں سے مرتب ہوئیں۔ اور وہ بھی کسی سابقہ تحریری ریکارڈ سے نہیں بلکہ زبانی روایات سے۔ اسلئے ان مجموعوں میں صحیح اور غلط، ہر قسم کی روایات جمع ہو گئیں۔ اب ہمارے پاس صحیح کو غلط سے الگ کرنے کا معیار یہ ہے کہ ان میں جو روایت قرآن کریم کے خلاف ہو اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ حضورؐ کی طرف غلط منسوب ہو گئی ہے۔

لیکن ہمارے قدامت پرست طبقہ کا اصرار ہے کہ ان کتبِ روایات میں جو کچھ آچکا ہے، اسے وحی منزل من اللہ کی طرح صحیح تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ جو یہ کہے کہ ان میں وضعی روایات بھی ہیں وہ "منکرِ حدیث ہے" اور منکرِ شانِ رسالت یعنی اگر کوئی ایسی روایت ہے جو قرآن کے خلاف ہے۔ یا اس سے نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس کے خلاف کوئی طعن پڑتا ہے، اس کے متعلق جو شخص یہ کہے کہ یہ نبی اکرمؐ کی حدیث نہیں ہو سکتی، وہ تو منکرِ شانِ رسالت ہے، اور جو اصرار کرے کہ وہ رسول اللہؐ ہی کی ہے، وہ ان کے

نزدیک شانِ رسالت کا ماننے والا ہے ہمارے نزدیک یہ رسول اللہؐ کی شان اقدس سے بہت بعید ہے کہ حضورؐ ایسا ارشاد فرمائیں کہ جنگ میں دشمن کی جو عورتیں تمہارے ہاتھ آئیں، انہیں استعمال کرو اور جب جی چاہے انہیں دوسروں کے ہاتھوں فروخت کر دو۔ اور ہمارے "علمائے کرام" کا ارشاد ہے کہ تمہیں یہ ماننا پڑے گا کہ یہ حضورؐ کا فیصلہ ہے اگر تم ایسا نہیں مانتے تو منکرِ حدیث اور منکرِ ناموسِ رسالتؐ ہو۔

ہم فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ اس باب میں کس کا مسلک صحیح ہے، اور اگر ہم دنیا سے کہیں کہ یہ اسلام کی تعلیم ہے۔ تو دنیا اس اسلام کے متعلق کیا کہے گی؟ والسلام۔

یتیم پوتے کی وراثت

یوں تو قرآن کریم کی تعلیم کا کونسا گوشہ ہے جس کی اعجازی کیفیت سے چشم بصیرت محوِ حیرت نہیں رہ جاتی۔ (اس کا تو ایک ایک لفظ بے مثل و بے نظیر ہے) لیکن بعض احکام کی جامعیت ایسی ہے جس پر غور و فکر سے روح وجد میں آجاتی ہے۔ انہی احکام میں قرآن کا قانونِ وراثت بھی ہے۔ قرآن نے اپنی چار مختصری آیات میں اتنا اہم اور وسیع قانون اس انداز سے اصولی طور پر سمیٹ کر رکھدیا ہے کہ اس کی جامعیت اور ایجاز پر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن ہماری بدبختی ملاحظہ ہو کہ یہی قانونِ وراثت جب ملّا کے ہتّے چڑھ گیا تو نہ صرف یہ کہ یہ قانون دنیا کا مشکل ترین مسئلہ بن گیا بلکہ اس کی بعض شقیں ایسی مضحکہ انگیز شکلیں اختیار کر گئیں کہ انہیں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ انہی گوشوں میں ایک مسئلہ یتیم پوتے کی وراثت کا ہے چونکہ یہ مسئلہ (قانونی مسائل کی طرح) فنی ہے اس لئے اسے ذرا غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس کی فنی اصطلاحات سے صرفِ نظر کر کے اسے عام فہم الفاظ میں سمجھایا جائے۔ ذرا ذیل کے نقشے کو سامنے رکھئے

زید

(زید کا بیٹا) بکر	عمر (زید کا بیٹا)
(بکر کا بیٹا) حامد	رشید (عمر کا بیٹا)

زید کی زندگی میں بکر فوت ہو گیا۔ اس کے بعد زید وفات پا گیا۔ زید کی وفات کے وقت اس کا بیٹا عمر بھی زندہ ہے۔ (اور رشید بھی) اور اس کے ساتھ اس کا یتیم پوتا (حامد) بھی۔ ملّا کا مذہب ہے کہ زید کی ساری جائداد عمر کے حصے میں آگئی۔ حامد کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس کا قصور؟ یہی کہ وہ یتیم ہے۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں اسے وراثت سے کیوں نہ محروم کیا جائے؟

مرے کو مارے شاہ مدار

ایسے ہی مواقع کے لئے کہا گیا ہے۔

ہم نے اس سے پیشتر ایک مرتبہ مختصراً اس مسئلے کے متعلق طلوعِ اسلام (کے باب المراسلات) میں لکھا تھا لیکن چونکہ اب یہ مسئلہ ملک کا قانون بن گیا ہے، اس لئے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھا جائے۔ پہلے ان دلائل کو لیا جائے جو اس کی محرومی کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس مضمون کو چھاپ دیا جائے جو اس سے قبل طلوعِ اسلام میں لکھا جا چکا ہے اور پھر علامہ اسلم جیراجپوری کا مقالہ "محجوب الارث" شائع کر دیا جائے۔ موخر الذکر مقالہ آجکل نایاب ہو چکا تھا۔ بڑی تلاش کے بعد ایک دوست نے . . . ہم پہنچایا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس طرح ایک اہم تحقیقی مضمون

طلوع اسلام کے دفتین میں محفوظ ہو جائے گا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اب آیئے ان دلائل کی طرف۔ رسالہ ترجمان القرآن (بابت مارچ ۱۹۵۳ء) میں حسب ذیل سوال اور اس کا جواب شائع ہوا ہے۔

سوال۔ دادا کی زندگی میں اگر کسی کا باپ مرجائے تو پوتے کو وراثت میں سے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ مشہور شرعی مسئلہ ہے جس پر اس وقت کی حکومت کی طرف سے عمل ہو رہا ہے۔ اس بارے میں مختلف مسالک کیا ہیں۔ اور آپ کس مسلک کو مزاج اسلامی سے قریب تر خیال فرماتے ہیں۔ اگر آپ کا مسلک بھی مذکورہ ہی ہے تو اس الزام سے بچنے کی کیا صورت ہے کہ اسلامی نظام جو یتیم کی دستگیری کا اسقدر مدعی ہے ایک یتیم کو محض اس لئے دادا کی وراثت سے محروم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو دادا کی وفات سے بعد تک زندہ نہ رکھ سکا۔"

اس کا جواب، ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی طرف سے یہ دیا گیا ہے۔

جواب۔ فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جاسکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں گویا اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ ویسے بھی یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے، کیونکہ پوتا بہر حال اپنے باپ کے واسطے ہی سے دادا کے مال میں حقدار ہو سکتا ہے نہ کہ براہِ راست خود۔ اسی طرح بہو اپنے شوہر کے واسطے سے خسر کے مال میں سے حصہ پاسکتی ہے نہ کہ براہِ راست خود۔ اگر ایک شخص کا بیٹا اس کی زندگی میں مرجائے اور وہ شادی شدہ نہ ہو تو آپ خود مانیں گے کہ اس کا حصہ ساقط ہو جائے گا۔ یہ نہیں کہ اس شخص کے مرنے پر اس کے ترکہ میں سے اس کے فوت شدہ بیٹے کا حصہ بھی نکالا جائے اور پھر اس کی میراث اس کی ماں اور اس کے بھائیوں وغیرہ کو پہنچائی جائے۔ اسی طرح اگر فوت شدہ لڑکے کی کوئی بیوی موجود ہو تو آپ خود مانیں گے کہ وہ اپنے خسر کے ترکہ میں سے حصہ پانے کی مستحق نہیں ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا نکاح ثانی ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ پھر آپ کو کیوں اصرار ہے کہ صرف اس کا بیٹا موجود ہونے کی صورت میں اس کا حصہ ساقط نہ ہو بلکہ وہ اس کے بیٹے کو پہنچے؟

رہا یتیم کی پرورش کا سوال، تو شریعت کی رو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کی پرورش کا انتظام کریں۔ نیز شریعت نے وصیت کا حکم اسی لئے دیا ہے کہ اگر کوئی مرنے والا اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو اور اس کے خاندان میں کچھ لوگ مستحق موجود ہوں تو وہ ان کے حق میں وصیت کرے ⅓ مال کی حد تک وہ وصیت کر سکتا ہے اور اس میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر وہ کوئی یتیم پوتا چھوڑ رہا ہے یا کوئی بیوہ بہو چھوڑ رہا ہے جو بے سہارا ہو، یا کوئی بیوہ بھاوج یا غریب بھائی یا بیوہ بہن چھوڑ رہا ہے تو ان کے لئے وصیت کر جائے۔ یہ گنجائش اسی لئے رکھی گئی ہے کہ قانونی وارثوں کے سوا خاندان میں جو لوگ مدد کے محتاج ہوں ان کی مدد کا انتظام کیا جاسکے۔

مودودی صاحب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ انھیں قرآن وحدیث میں کوئی ایسا حکم صریح نہیں ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جاسکے۔ لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں کہ "لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے"۔ یہی وہ تقلید ہے جس کی قرآن اس شدت سے مخالفت کر رہا ہے اور جس کی وجہ سے قوموں میں سوچنے اور سمجھنے کی قوت سلب ہوجاتی ہے اور وہ کالانعام بل هم اضل کی (حیوانی بلکہ ان سے بھی بدتر) سطح پر پہنچ جاتی ہیں۔ خود مودودی صاحب اپنی بیشتر تحریروں میں لکھ چکے ہیں کہ جن معاملات میں قرآن اور حدیث خاموش ہوں انھیں ہم اپنی بصیرت سے حل کریں گے۔ اس چیز کو انھوں نے "دستور پاکستان" کے اس خاکے میں بھی بیان کیا ہے جو ان کی طرف سے مرتب ہوکر شائع ہوا تھا۔ لیکن اب ان کا ارشاد یہ ہے کہ جو امور سلف سے خلف تک وراثتاً منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں ان کے خلاف رائے دینا مشکل ہے، خواہ ان کی تائید میں قرآن وحدیث کا کوئی حکم بھی نہ ملے۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے اس مسلک کی تائید میں دلائل لاکر (بزعم خویش) ثابت کیا ہے کہ یہ مسلک معقول بھی ہے۔ اب ان دلائل اور ان کی معقولیت کو دیکھئے۔ دلیل یہ ہے کہ

(۱) پوتا اپنے باپ کے واسطے سے ہی دادا کے مال میں حقدار ہوسکتا ہے، نہ کہ براہ راست
جس طرح بہو اپنے شوہر کے واسطے ہی سے خسر کے مال میں حصہ پاسکتی ہے۔

(۲) فوت شدہ وارث کا حصہ نہیں نکالا جاتا۔ اس لئے یتیم پوتا اپنے دادا کے مال سے حصہ نہیں پاسکتا۔

یہ دلائل عقل، علم اور قرآن سب کے خلاف ہیں حتیٰ کہ فقہی قانونِ وراثت کے بھی خلاف۔

مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ "پوتا اپنے باپ کے واسطے سے ہی دادا کے مال میں حقدار ہوسکتا ہے"۔ اور جب واسطہ نہ رہے تو یہ حق ساقط ہوجاتا ہے"۔ یہ دعویٰ بنیادی طور پر غلط ہے۔ ذرا اس نقشے کو سامنے لائیے جو پہلے پیش کیا جاچکا ہے۔ مودودی صاحب کے دعوے کی بنا پر رشید، عمر کے واسطے سے زید کے مال کا حقدار ہے۔ اور حامد اس لئے زید کے مال کا حقدار نہیں کہ اس کا واسطہ (بکر) موجود نہیں ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا عمر کی موجودگی میں رشید اپنے دادا (زید) کے مال سے ایک پائی بھی پاسکتا ہے؟ عمر کی موجودگی میں زید کے مال کا حقدار عمر ہی ہے نہ کہ رشید۔ یہ قانونِ وراثت کا ابتدائی قاعدہ ہے۔ اب دیکھئے کہ اس دلیل کی رو سے بات کیا بنی۔

(ا) حامد اپنے دادا (زید) کے مال سے حصہ نہیں پاسکتا کیونکہ ان دونوں کا درمیانی واسطہ (بکر) موجود نہیں ہے۔

(ب) رشید اپنے دادا (زید) کے مال سے حصہ نہیں پاسکتا کیونکہ ان دونوں کا درمیانی واسطہ (عمر) موجود ہے۔

اب اور آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب کی دلیل کو پھر دہرا لیجئے کہ حامد اپنے باپ (بکر) کے واسطے سے ہی زید کے مال کا حقدار ہوسکتا ہے۔ اور چونکہ حامد اور زید کے درمیان واسطہ (بکر) نہیں رہا اس لئے حامد زید کے مال کا حقدار نہیں ہوسکتا۔ لیکن مودودی صاحب کو شاید اس کا علم نہیں کہ اگر زید کی زندگی میں حامد فوت ہوجائے تو زید اس کے مال کا حقدار ہوتا ہے۔

اور یہ بھی کہ اگر زید کی زندگی میں عمر بھی فوت ہوجائے تو زید کی موت پر حامد اور رشید دونوں اس کے مال کے حقدار ہوجاتے ہیں۔

کیا مودودی صاحب بتائیں گے کہ

(۱) حامد اور زید کے درمیان کونسا واسطہ تھا جس کی رو سے زید، حامد کے مال میں حقدار بن گیا؟ اور

(۲) زید کی زندگی میں عمر کے مرجانے کی صورت میں، وہ کونسا واسطہ تھا جس کی رُو سے حامد اور رشید دونوں یتیم پوتے زید کے مال کے وارث قرار پا گئے؟

یہ تھی مودودی صاحب کی دلیل! حیرت ہے کہ انھیں (قرآن تو ایک طرف) فنِ وراثت کے ابتدائی اصولوں تک سے بھی واقفیت نہیں۔

مودودی صاحب نے یتیم پوتے کے ساتھ بیوہ بہو کی مثال پیش کرکے اس شبہ کو اور بھی قوی کردیا ہے کہ انھیں فی الواقعہ قانونِ وراثت کے مبادیات تک کا بھی علم نہیں۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ اس مثال سے عوام اس کے قائل ضرور ہوگئے ہوں گے کہ مودودی صاحب کی دلیل بڑی وزنی ہے۔ کیونکہ جب بکر کی بیوہ زید کے مال سے حصہ نہیں پاسکتی تو بکر کا بیٹا (حامد) کس طرح حصہ پالے گا!

قرآن کی رو سے رشتہ داروں کی دو قسمیں ہیں (اور یہ تقسیم ایسی کھلی ہے کہ ہر شخص اسے تسلیم کریگا)۔ ایک نسبی رشتہ دار یعنی وہ جو اشتراکِ نسب کی بنا پر رشتہ دار ہوں۔ مثلاً باپ، دادا، پردادا وغیرہ اور نیچے کی طرف بیٹا، پوتا، پرپوتا وغیرہ۔ یا بھائی بہن۔

دوسری قسم عقدی رشتے کی ہے جس میں میاں بیوی شامل ہیں۔ میاں بیوی کا رشتہ صرف نکاح کے عہد و پیمان سے ہوتا ہے اشتراکِ نسب کی بنا پر نہیں ہوتا۔ اس لئے میاں بیوی کا وارث ہوتا ہے اور بیوی میاں کی۔ بکر کی بیوہ، زید سے نہ تو نسبی رشتے میں ہے نہ اس کے عقد میں آئی ہے۔ پھر وہ زید کے مال میں کس طرح وارث ہوسکتی ہے؟ وہ اپنے شوہر کے مرنے پر اس کے ترکے سے وراثت پاسکتی ہے۔ زید سے اس کا وراثتی تعلق ہی نہیں۔ نسب کا رشتہ مستقل رشتہ ہوتا ہے لیکن عہدی رشتہ، صرف عہد و پیمان تک رہتا ہے۔ بیٹا، بیٹا ہی رہتا ہے خواہ اس کا باپ زندہ ہو یا مر چکا ہو۔ لیکن اگر بیوی سے عہدِ نکاح توڑ دیا جائے (یعنی طلاق دیدی جائے) تو اس سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ دادا اور پوتا نسبی رشتے دار ہیں۔ بکر زندہ ہے تو، مر گیا ہے تو، حامد بہر حال زید کا پوتا ہے۔ بہو اور خسر کا یہ رشتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے بہو اور خسر کی مثال سے دادا اور پوتے پر دلیل لانا یکسر غلط ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب کا یہ سوال سرے سے غلط ہے کہ کوئی شخص کسی واسطے سے متوفی کے مال میں حقدار ہوتا ہے، مثلاً (نقشے میں دیکھئے) زید کی موت پر (مودودی صاحب کے پیش کردہ مسلک کے مطابق) عمر کو زید کے ترکے سے ایک ہزار روپیہ ملا۔ رشید کا اس ہزار روپے میں ایک پائی کا بھی حصہ نہیں۔ عمر کے مرنے پر رشید، عمر کے مال کا حقدار ہوگا۔ اگر عمر نے اپنی زندگی میں وہ ہزار روپیہ خرچ کردیا جو اسے زید کے ترکے میں ملا تھا تو رشید کے حصے میں اس ہزار روپے میں سے پھر بھی کچھ نہیں آئے گا۔ لہٰذا یہ اصول ہی غلط ہے کہ رشید عمر کے واسطے سے زید کے مال میں حقدار ہوتا ہے۔ اصول اس کے برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ کوئی شخص <u>واسطے</u> کی موجودگی میں کسی کے مال میں حقدار نہیں ہوتا۔ اس اصول کی وضاحت ذرا آگے چل کر آئے گی جہاں <u>واسطے</u> کی بجائے حجب کا لفظ استعمال کیا جائے گا جو اس فن کی صحیح اصطلاح ہے۔

قرآنی احکام وراثت میں ہے کہ

(۱) للرجال نصیب مما ترك الوالدان ۴/۷

(۲) یوصیکم اللہ فی اولادکم ۴/۱۱

یعنی "اولاد" اپنے "والدین" کے ترکہ سے حصہ پاتی ہے۔ یہ حصہ خود خدا نے مقرر کر دیا ہے۔

ہمارے ہاں "اولاد" کے معنی عام طور پر صرف بیٹا، بیٹی کئے جاتے ہیں اور والدین کے معنی صرف ماں باپ۔ لیکن ان الفاظ کے معنی وسیع ہیں۔ ولد میں بیٹا اور بیٹے کی اولاد در اولاد (پوتا، پرپوتا وغیرہ) سب شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح والد میں باپ اور باپ کے والد در والد (دادا، پردادا وغیرہ) سب شامل ہوتے ہیں۔ اس اصول کو فقہ میں بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ اولاد میں نیچے تک اور والدین اوپر تک سب شامل ہوتے ہیں۔

یہاں سے دوسرا سوال پیدا ہوا۔ مثلاً ایک شخص مر گیا۔ اس کا باپ، دادا، پردادا بھی موجود ہیں اور بیٹا، پوتا، پرپوتا بھی۔ قرآن نے باپ کا حصہ بھی مقرر کیا ہے اور بیٹے کا بھی۔ لیکن جب "والد" کے اندر اوپر تک (دادا، پردادا) شامل ہیں اور "ولد" کے اندر نیچے تک (پوتا، پرپوتا) تو پھر ترکہ کی تقسیم کس طرح ہو؟ اس کیلئے قرآنی اصول اقرب کا ہے۔ اقرب کے معنی ہیں وہ شخص جس کے اور میت کے درمیان کوئی اور موجود نہ ہو۔ مثلاً

نور (دادا)
↓
بشیر (والد)
↑
متوفی ——— احمد —— (متوفی)
↓
خالد (بیٹا)
↓
نذیر (پوتا)
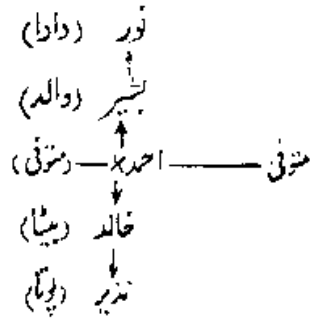
متوفی (احمد) سے اوپر کی طرف، متوفی کا باپ (بشیر) نور اور احمد کے درمیان روک (یا پردہ یا حجب) ہے۔ اس لئے احمد، نور کا اقرب نہیں ہے۔ اسی طرح نیچے کی طرف، خالد (بیٹا) احمد اور نذیر کے درمیان روک ہے۔ اسلئے احمد نذیر کا اقرب نہیں ہے۔ اس صورت میں احمد کے ترکے میں اوپر کی طرف بشیر اور نیچے کی طرف خالد حقدار ہوں گے۔ لیکن اگر احمد کی وفات کے وقت بشیر زندہ نہ ہو۔ تو احمد، نور کا اقرب ہو جائیگا اور جو حصہ بشیر کا تھا وہی حصہ نور کا ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر احمد کی وفات کے وقت خالد زندہ نہ ہو تو احمد، نذیر کا اقرب ہو جائیگا اسلئے جو حصہ خالد کا تھا وہی حصہ نذیر کا ہو جائے گا۔

اب پھر صفحہ ۷۲ کے نقشے کو دیکھئے۔ زید کی وفات کے وقت ایک طرف رشید اور زید کے درمیان عمر کی روک موجود ہے اس لئے زید کے ترکے میں عمر کی موجودگی میں رشید حصہ دار نہیں ہو سکتا۔ لیکن دوسری طرف حامد اور زید کے درمیان کوئی روک نہیں (جو روک تھی — یعنی بکر — وہ پہلے ہی اٹھ چکی ہے) اس لئے حامد زید کے ترکے میں حقدار ہے اور قرآن نے (ایسی صورت میں) جو حصہ ولد کے لئے مقرر کیا ہے

وہ اسے ملے گا۔ اسی طرح حامد کی موت کی صورت میں حامد کے مال سے زید کو وہ حصہ ملے گا جو قرآن نے والد کے لئے مقرر کیا ہے۔ کیونکہ اب حامد اور زید کے درمیان کوئی روک نہیں۔ (روک — بکر — پہلے اٹھ چکی ہے)۔ اسی طرح اگر عمر بھی زید کی زندگی میں مر چکا ہوتا تو رشید، زید کے مال سے اپنا حصہ لیتا کیونکہ اس صورت میں رشید اور زید کے درمیان کوئی روک نہ ہوتی۔

اس سے واضح ہے کہ

(۱) والدین اور اولاد کے جو حصے قرآن نے مقرر کئے ہیں وہ صرف ماں باپ اور بیٹی بیٹے کے حصے نہیں بلکہ اوپر تک اور نیچے تک مسلسل جاتے ہیں۔

(۲) حصہ اسی کو ملتا ہے جس کے اور متوفی کے درمیان کوئی حجاب (یا روک) نہ ہو۔ جب روک اٹھ جائیگی تو حصہ مل جائیگا۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کا اصول، کس طرح قرآنی اصول کی نقیض ہے۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ بیوہ بہو کو خسر کے مال سے کیوں حصہ نہیں ملتا۔ اس لئے کہ خسر کے مال میں بہو کا حصہ قرآن نے مقرر ہی نہیں کیا۔ اسلئے اس کے شوہر کی موجودگی یا اس کی وفات اس سوال پر اثر انداز ہی نہیں ہوتی۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ تم زید کے مرنے پر اس کے فوت شدہ بیٹے، بکر کا حصہ نکال کر حامد کو دیتے ہو اور یہ غلط ہے۔ لیکن ہم پوچھتے یہ ہیں کہ بکر کا حصہ نکالتا کون ہے؟ (حصہ صرف اس کا ہوتا ہے جو متوفی کی وفات کے وقت زندہ موجود ہو — مُردوں کے حصے کوئی نہیں نکالتا)۔ قرآن کی رُو سے، حامد اپنے دادا (زید) کے ترکے میں حقدار ہے اس لئے حامد کو خود اس کا حصہ ملتا ہے نہ کہ اس کے متوفی باپ (بکر) کا حصہ۔ اگر بکر کا حصہ نکلتا تو اس کی بیوہ کو بھی کچھ مل جاتا۔ لیکن جب بکر کا حصہ ہی نہیں تو بیوہ یا بکر کے اور رشتہ داروں کو کیا ملے گا؟ پھر سن رکھئے کہ حامد کو براہ راست (زید کے ترکے سے) اپنا حصہ ملتا ہے نہ کہ اپنے متوفی باپ (بکر) کا حصہ۔

ان تصریحات کے بعد آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ ہمارے ملا کا یہ مذہب کہ یتیم پوتا، اپنے دادا کی میراث سے حصہ نہیں پا سکتا، کس طرح قرآن کی کھلی ہوئی مخالفت ہے اور ملا کے اس مسلک کی تائید میں مودودی صاحب کے دلائل کی حیثیت کیا ہے؟

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ "رہا یتیم کا سوال تو شریعت کی رو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کی پرورش کا انتظام کریں۔" یعنی، قرآن نے اس یتیم کا جو حصہ مقرر کیا ہے اس سے اسے محروم کر دیا جائے (اور وہ حصہ اس کے چچا کو دلا دیا جائے) اور پھر اس محروم و یتیم کو خیرات کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرنے کیلئے مجبور کر دیا جائے۔ دوسری طرف اس کے چچا کو، اس کی جائداد کا مالک بنا کر اس سے اپیل کی جائے کہ اس یتیم کی پرورش کرو۔ اللہ تمہیں اس کی جزائے خیر دیگا۔ قرآن میں یہودیوں کے متعلق آیا ہے کہ وہ پہلے اپنے بھائیوں کو دشمن کے حوالے کر دیتے تھے اور پھر انہیں فدیہ دیکر چھڑاتے تھے تاکہ اس سے ثواب حاصل ہو۔ اسی قسم کا انتظام یہ حضرات یتیم پوتے کے لئے کرتے ہیں۔

مودودی صاحب نے ضمناً وصیت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ "⅓ حصہ مال کی حد تک وہ وصیت کر سکتا ہے۔"

یہ چیز بھی قرآن کریم کی کھلی ہوئی مخالفت ہے۔ قرآن نے وصیت کا پورا پورا حق دیا ہے اور کہیں یہ نہیں لکھا کہ وصیت صرف ۱/۳ حصہ مال ہی میں ہوسکتی ہے۔ اللہ نے وصیت کے حکم میں کہیں یہ نہیں کہا کہ وصیت صرف ۱/۳ حصہ میں ہوسکتی ہے۔ لیکن ملا کہتا ہے کہ نہیں! تم وصیت صرف ۱/۳ حصہ تک کر سکتے ہو۔ یعنی (معاذ اللہ) خدا کو اتنی بات بھی نہیں کہنی آئی تھی کہ وصیت ۱/۳ حصہ میں کی جا سکتی ہے۔[1] وہ اس کیلئے بھی روایات کا محتاج ہوگیا۔ یہ ہے ملا کا روایاتی مذہب!!

جب ہم کہا کرتے ہیں کہ ملا کا مذہب بالکل تو ایجاد ہے اور قرآن سے اسے کچھ تعلق نہیں تو بعض (ناواقف) حضرات کو اس سے بڑی حیرت ہوتی ہے اور وہ اسے صحیح تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ اب آپ صرف اس ایک مسئلہ میں دیکھ لیجئے (یعنی یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے میں) کہ قرآن کا حکم کیا ہے اور ملا کا مذہب کیا! اس کے بعد آپ خود سوچ لیجئے کہ جس چیز کو ملا "نظام شریعت" کہہ کر پکارتا ہے اُسے قرآن سے کسقدر تعلق ہوگا! ہزار برس سے مُلا اپنے اس غیر قرآنی مذہب کو لئے ہوئے آرہا ہے۔ نہ معلوم اس سے کسقدر یتیم پوتے، محروم الارث ہوکر تباہ و برباد ہوئے ہوں گے۔ ہماری بدبختی کہ اب یہی غلط مذہب، ملک کا قانون بن گیا ہے۔ نہ معلوم اب کسقدر مظلوم یتیم ہوں گے جو ملا کی اس کند چھری سے ذبح ہو چکے ہوں گے اور آئندہ ذبح ہوں گے۔

بات تو اتنی ہی ہے جسے ہم اوپر لکھ چکے ہیں لیکن مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے ہم اس مضمون کو بھی دہرا دینا چاہتے ہیں جو اس سے قبل طلوع اسلام (بابت جون ۱۹۴۹ء) میں شائع ہوچکا ہے۔ وہو ہذا۔

یتیم پوتے کا حصہ

کچھ عرصہ سے ہمارے پاس قرآن کریم کے قانون وراثت سے متعلق بہت سے استفسارات پہنچ رہے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں سوال یہ پوچھا جارہا ہے کہ ہمارا مروجہ فقہی قانون جس کی رو سے یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے محروم کردیا جاتا ہے قرآن کی رو سے کیسا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنی چار مختصر سی آیات میں پورے کا پورا قانونِ وراثت جس حسن و خوبی اور جامعیت و اکملیت کے ساتھ بیان کردیا ہے، جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو انسان، قرآن کے اس اعجاز پر وجد کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن جب اس کی نگاہ اس قانون پر پڑتی ہے جو ہمارے فقہاء نے مرتب کیا ہے اور جو ہزار سال سے

---

[1] کہا جا سکتا ہے کہ جب قرآن میں وراثت کے حصے مقرر ہو چکے ہیں تو پھر وصیت کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ سو قرآن نے وراثت کے احکام کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے (اور اسے بار بار دہرایا ہے کہ) یہ حصے وصیت پوری کرنے اور قرضہ ادا کردینے کے بعد عمل میں آئیں گے۔ (من بعد وصیۃ یوصی بھا او دین)۔ یعنی وصیت کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ پورا مال وصیت سے (COVER) نہ ہوتا ہو۔ یا ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ انسان وصیت نہیں کر پایا اور اس کی موت واقع ہو گئی تو پھر تقسیم مال قرآنی حصوں کے مطابق ہوگی۔ یہ قانون کسقدر انسانیت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اس کے متعلق کسی اور وقت لکھا جائے گا۔

مسلمانوں میں مروج چلا آرہا ہے تو وہ ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ کس قسم کا قانون ہے! اس مروجہ قانون میں نہ صرف یہ کہ باہمدگر متضاد شقیں موجود ہیں بلکہ اس میں قرآنی اصولوں کی صریح مخالفت بھی ہے جنھیں قرآن وارث قرار دیتا ہے یہ قانون انھیں وراثت سے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن ان کے لئے کچھ حصہ مقرر کرتا ہے یہ قانون اس کے خلاف کچھ اور ہی دیتا ہے۔ کہیں ایک ہی درجہ کے دو رشتہ داروں میں ایک وارث قرار پاجاتا ہے دوسرا محروم رہ جاتا ہے اور سب سے بڑی افسوسناک صورت یہ کہ اس قانون کی رو سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ (معاذ اللہ) خدا چوتھی جماعت کے بچوں جتنا بھی حساب نہیں جانتا۔ اس اصول کو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ جب کسی چیز کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے تو تمام حصوں کی حاصل جمع ایک (۱) آنی چاہئے۔ اگر حاصل جمع ایک نہیں آتی تو ریاضی کے ابتدائی قاعدے کی رو سے یہ تقسیم غلط ہے۔ مثلاً ($\frac{1}{2}+\frac{1}{4}+\frac{1}{4}=1$) یہ تقسیم درست ہے۔ لیکن ($\frac{1}{2}+\frac{1}{2}+\frac{1}{3}=\frac{4}{3}$) یہ تقسیم غلط ہے کیونکہ ان حصوں کا مجموعہ (۱) نہیں بلکہ ($1\frac{1}{3}$) ہے۔

یہ ہے بہرحال وہ قانونِ وراثت جسے ہم بڑے فخر سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ اس سے ہم ایک طرف اللہ تعالیٰ کے متعلق کیا تصور پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف کس طرح علمی دنیا میں اپنے آپ کو اضحوکہ بناتے ہیں لیکن مسلمانوں کو اس سے کیا غرض کہ ان کے کسی عمل سے خدا کے متعلق کیا تصور پیش ہوتا ہے اور دنیائے علم و بصیرت میں ان کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے۔ انھیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے بس اسی طرح ہوتا چلا جائے اور جو شخص اس کے خلاف ذرا سی آواز بلند کرکے انھیں کہے کہ آؤ ہم اپنی روش کو اللہ کی کتاب کے مطابق کرلیں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے۔

اس مختصر سی تمہید سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہمارا مروجہ قانونِ وراثت پورے کا پورا ایسا ہے کہ قرآن کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے اور اس کی جگہ اس قانون کو رائج کیا جائے جو خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے۔ اس وقت ہم اس قانون کے اس ایک گوشے کو سامنے لائیں گے جس کے متعلق نمایاں طور پر استفسارات موصول ہوئے ہیں یعنی یتیم پوتے کی وراثت کا سوال۔

قانونِ وراثت چونکہ ایک فنی (Technical) مسئلہ ہے اسلئے اسے سمجھنے کیلئے ذرا دقتِ نظر کی ضرورت ہوگی۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس کی فنی اصطلاحات سے بچ کر عام فہم اور سلیس انداز میں اسے پیش کریں لیکن اس کے باوجود آپ کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ اسے یونہی رواں نہ پڑھتے جائیں بلکہ ایک ایک ٹکڑے کو سمجھ کر آگے بڑھیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اصل مسئلہ ہے کیا۔ یہ اس طرح سے سمجھ میں آجائے گا۔

زید

بکر (زید کی زندگی میں فوت ہوگیا) — عمر (زید کی وفات کے وقت زندہ ہے)

خالد (زندہ ہے) — حامد (زندہ ہے)

خالد اور حامد دونوں زید کے حقیقی پوتے ہیں۔ خالد یتیم ہے۔ حامد کا باپ زندہ ہے۔ زید کی وفات پر اس کی جائیداد کی تقسیم کا سوال پیش آتا ہے

ہمارا فقہی قانون وراثت کہتا ہے کہ اس جائداد میں خالد (جو یتیم ہے) کچھ حصہ نہیں پائے گا۔ جائیداد عمر کو ملے گی اور اس کی وساطت سے اس کے بیٹے حامد کو۔ اگر محض عقل عام کی رو سے بھی دیکھا جائے تو یہ فیصلہ سراسر ناانصافی پر مبنی دکھائی دیگا۔ خالد یتیم ہے۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں۔ لیکن یہی اس کا جرم قرار دیدیا جاتا ہے اور اس طرح اسے اپنے باپ دادا کے ترکہ سے محروم کردیا جاتا ہے۔ اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو وہ برابر کا حصہ لیتا۔ وہ مر چکا ہے اس لئے اب خالد کو کچھ نہیں مل سکتا۔ اس کا چچا جائیداد کا وارث ہوگا۔

اب آیئے اس طرف کہ ہمارے فقہا اس کے لئے دلائل کیا پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں ان کی دو دلیلیں اہم ہیں۔

(۱) وہ کہتے ہیں کہ جو شخص مرنے والے کے ساتھ کسی دوسرے شخص کے واسطے سے رشتہ رکھتا ہے تو وہ شخص اس واسطہ کی موجودگی میں ترکہ نہیں پا سکتا یعنی خالد کا رشتہ اپنے دادا زید کے ساتھ اپنے والد بکر کے واسطے سے ہے براہ راست نہیں۔

ٹھیک ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ بکر تو مر چکا ہے اسلئے اب خالد اپنے مرحوم باپ کا قائم مقام ہے اور اس کے اور اس کے دادا (زید) کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کا چچا (عمر) درمیان میں واسطہ نہیں بن سکتا اس لئے کہ خالد کا اپنے دادا سے رشتہ اپنے چچا عمر کے واسطہ سے نہیں ہے، اپنے باپ کے واسطے تھا اور یہ واسطہ اب درمیان سے نکل چکا ہے۔

اس مقام پر یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ہمارے فقہا خود اپنے وضع کردہ اصول پر بھی قائم نہیں رہتے۔ وہ خالد کو اپنے دادا (زید) کی وراثت سے تو محروم کرتے ہیں لیکن اگر زید کی زندگی میں خالد مر جائے تو اس کی جائیداد زید کو دیدیتے ہیں۔ یعنی دادا تو یتیم پوتے کا براہ راست رشتہ دار ہوتا ہے لیکن وہی پوتا اپنے دادا کا براہ راست رشتہ دار نہیں ہوتا۔

اب ان کا دوسرا اصول لیجئے۔ دراصل یہ دوسرا اصول ہی وہ محکم اصول قرار دیا جاتا ہے جس کی رو سے یتیم پوتا، وراثت سے محروم کردیا جاتا ہے یہ اصول ہے۔

الاقرب فالاقرب یعنی قریب کے رشتہ دار کے ہوتے ہوئے بعید کا رشتہ دار محروم رہتا ہے۔

(دادا اور پوتے والی مثال میں) چونکہ عمر (زید کا بیٹا ہونے کی جہت سے) زید کا قریب کا رشتہ دار ہے اس لئے خالد (جو پوتا ہونے کی جہت سے زید کا بعید کا رشتہ دار ہے) عمر کی موجودگی میں محروم رہ جائے گا۔

زید

بکر (قریب کا رشتہ دار) — عمر (قریب کا رشتہ دار)

خالد (عمر کی موجودگی میں زید کا بعید کا رشتہ دار)
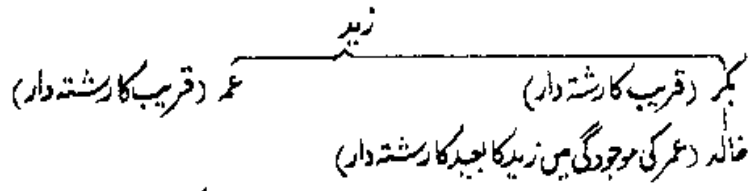
اول تو یہ سن لیجئے کہ ہمارے فقہا، خود اپنے اس اصول پر بھی قائم نہیں رہتے۔ اصول یہ ہے کہ

قریب کے رشتہ دار کی موجودگی میں بعید کا رشتہ دار محروم رہ جاتا ہے۔

مثلاً رشید کا انتقال ہوگیا۔ اس کا دادا بھی موجود ہے اور بیٹا بھی۔ ظاہر ہے کہ بیٹا قریب کا رشتہ دار ہے اور دادا بعید کا۔ لہذا اس کے بیٹے

کی موجودگی میں اس کے دادا کو کچھ نہیں ملنا چاہئے لیکن ہمارے فقہا دادا کو حصہ دیتے ہیں اور اس طرح خود اپنا قائم کردہ اصول بھی قائم نہیں رہنے دیتے۔

اب آیئے اس اصول کی طرف۔ اس اصول کو اس آیت سے مستنبط کیا جاتا ہے۔

للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منہ او کثر نصیبا مفروضا (۴/۷)

مردوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو والدین اور اقربا نے چھوڑا ہے اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو والدین اور اقربا نے چھوڑا ہے خواہ ترکہ تھوڑا ہو یا بہت۔ ایک معین حصہ (جو بعد میں بیان کیا گیا ہے)

یہ آیت میراث کے قانون کی تمہید ہے۔ ہم اس وقت اس عظیم اصول کی تشریح میں نہیں جانا چاہتے جو اس قانون میں بیان کیا گیا ہے۔ نہ ہی اس میں کہ جب والدین خود اقربا میں شامل ہیں تو ان کا الگ ذکر کیوں کیا گیا۔ یہ نکات اپنے مقام پر سامنے آئیں گے۔ اس وقت صرف نقطہ زیر نظر کو زیر رہنا چاہئے۔ آیت میں اقربون آیا ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ چونکہ رشتہ دار قرابت کے لحاظ سے بہت سے قریب اور بعید ہوتے ہیں، مثلاً والدین، اولاد، اولاد کی اولاد، بھائی، بہن، چچا، پھوپھی وغیرہ۔ اور یہ ممکن نہیں کہ سب کے سب خواہ قریب ہوں یا بعید ایک ساتھ وارث ہوں، اس لئے وراثت کا مدار قربیت پر ہے۔ یعنی میت کے ترکہ میں سے اسی کو حصہ ملے گا جس کا وہ (مرحوم) اقرب ہوگا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اقربا جو چھوڑ کر مریں اس میں سے مردوں اور عورتوں کو حصہ ملے گا۔ یہ نہیں کہا کہ میت کے اقربین کو حصہ ملے گا۔ یہ فرق بڑا نازک ہے اور اس کو نظر انداز کر دینے سے تدوین فقہ کے وقت یہ اصول بنایا گیا کہ میت کا قریبی رشتہ دار اپنے سے دور کے رشتہ دار کو محروم کر دیتا ہے اور اس اصول کی بنا پر یتیم پوتے کو، مرنے والے کے بیٹے کی موجودگی میں وراثت سے محروم کر دیا

یہ فرق چونکہ بڑا نازک ہے اسلئے اسے اور وضاحت سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تمہارے اقرب جو چھوڑ کر مریں اس کی تقسیم یوں ہوگی۔ یعنی دیکھنا یہ ہوگا کہ مرنے والا اپنے زندہ رشتہ داروں میں سے کس کس کا اقرب تھا۔ اقرب کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اور میت میں کوئی درمیانی واسطہ موجود نہ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ زندہ رشتہ داروں میں سے جو میت کا سب سے قریبی ہو اس کو حصہ ملے گا، جو اس سے دور کا رشتہ دار ہو اسے حصہ نہیں ملے گا۔ ہر اقرب کو حصہ ملے گا۔ یعنی ہر اس رشتہ دار کو جس کے اور میت کے درمیان کوئی واسطہ موجود نہ ہو۔ مثلاً

سعید ———— کریم کا دادا زندہ ہے۔
رحیم ———— کریم کا والد فوت ہو چکا ہے۔
کریم ———— اس کی وفات ہوئی ہے۔
رشید ———— کریم کا بیٹا زندہ ہے۔

کریم کا قریب ترین رشتہ دار رشید ہے (بیٹا جو بلا واسطہ رشتہ دار ہے) سعید (کریم کا دادا) کریم کا بالواسطہ رشتہ دار ہے۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ قریب ترین کی موجودگی میں اس سے بعید رشتہ دار محروم ہو جاتا ہے تو رشید کی موجودگی میں سعید کو محروم ہو جانا چاہئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ رحیم کی وفات کے بعد سعید اور رشید دونوں کریم کے اقرب ہو گئے۔ اوپر کی طرف کریم اور سعید کے درمیان کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اور نیچے کی طرف کریم اور رشید کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ لہٰذا اقرب کے معنی ہوئے وہ رشتہ دار جس کے اور متوفی کے درمیان، متوفی کی وفات کے وقت کوئی واسطہ موجود نہ ہو۔ جب صورت یہ ہے تو پھر پہلی مثال کو سامنے لائیے۔

زید

بکر (وفات پا چکا ہے) — عمر (زندہ ہے)

خالد (زندہ ہے) — حامد (زندہ ہے)

جس طرح اوپر کی مثال میں رحیم کی وفات سے سعید اور کریم اقرب (براہ راست رشتہ دار) ہو گئے تھے اسی طرح بکر کی وفات سے زید اور خالد اقرب (براہِ راست رشتہ دار) ہو گئے ہیں۔ اور براہ راست رشتہ دار (اقرب) وارث ہوتا ہے۔ لہٰذا خالد کو زید کے ترکہ میں سے حصہ ملے گا۔ حامد کو نہیں ملے گا، کیونکہ اس کے اور زید کے درمیان عمر موجود ہے۔ اگر عمر بھی فوت ہو چکا ہوتا تو پھر خالد کی طرح حامد کو بھی حصہ مل جاتا۔

وراثت کے قانون میں ایک چیز کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہئے اور وہ ہے قائم مقامی۔ باپ کی وفات سے بیٹا اس کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ بکر کی وفات سے خالد نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ وراثت کا سارا دارومدار قائم مقامی پر ہے۔ درمیانی واسطہ اٹھ جانے سے بعید کا رشتہ دار درمیانی واسطہ کا قائم مقام اور اس طرح میت سے اقرب ہو جاتا ہے۔ اور قرآن کے حکم کے مطابق، مرنے والا (مورث) جن لوگوں کا اقرب ہو گا وہ لوگ وراثت پائیں گے۔ فقہا نے اقرب کا استعمال ورثہ (زندہ رشتہداروں) کے لئے کیا جس سے بہت سی غلطیوں میں پڑ گئے۔ قرآن کے بیان کردہ اصول کے بعد ہم کو صرف یہ متعین کرنا تھا کہ میت کس کس کا اقرب ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی قاعدہ بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ فقہ نے لفظ اقرب کی نسبت بھی غلطی کی اور پھر جو قواعد اس پر متفرع کئے ان پر عمل کرنا ناممکن ہو گیا جس کی وجہ سے کہیں خود اپنے بنائے ہوئے قواعد کے خلاف چل نکلے اور کہیں قرآن کے بھی خلاف۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ ہمارے فقہا (رحمہم اللہ) نے دانستہ ایسا کیا۔ ہر انسان کے تفقہ میں غلطی کا امکان ہے۔ اس لئے قصور ان کا نہیں۔ اصل قصور ہے اس ذہنیت کا جس کی رو سے یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ اسلاف میں سے جو کچھ کسی نے کہہ دیا ہے وہ منزل من اللہ کی طرح تنقید کی حد سے بالا ہے اس لئے اس کے متعلق کسی پس آئندہ کا سوچنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ہمیں اپنے اسلاف کی فکر کے نتائج پر آنکھیں بند کر کے چلتے جانا چاہئے۔ یہی اسلاف پرستی اس قوم کو لے ڈوبی۔ ابھی ایک مسئلہ وراثت کو لیجئے۔ قرآن نے وصیت کا حکم دے کر انفرادی مصالح کی حفاظت کا پورا پورا سامان کر دیا تھا۔ فقہ اور روایات نے وصیت کو ممنوع قرار دے کر ان تمام مصالح کو ختم کر دیا جس سے عجیب عجیب قسم کی الجھنیں پیدا ہو گئیں۔ پھر قانون وراثت میں تفقہ کی غلطیوں نے قرآنی قانون کو کچھ سے کچھ بنا دیا جس سے کروڑوں

جائز وارث اپنے آباؤاجداد کی جائدادوں سے محروم ہوگئے۔ اگر اسلاف پرستی نہ ہوتی تو ایک ایک کی اجتہادی غلطی کی گرفت دوسرا کرلیتا اور اس طرح اس کے نقصانات آگے نہ بڑھتے۔ اس ایک مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قانون اسلامی کا مدار قرآن پر ہونا چاہئے تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے۔ آپ اندازہ فرمائیے کہ اگر ہم نے اس فیصلہ کے بعد کہ ہماری حکومت کا آئین اسلامی ہونا چاہئے، آئین وقانون سازی کا کام ان کے سپرد کردیا جن کا عقیدہ ہے کہ فقہ اور روایات میں جو کچھ لکھا چلا آرہا ہے وہ وحی منزل کی طرح منزہ عن الخطاء ہے اور ہمیں اس پر تنقید کا کوئی حق نہیں، تو ان کا وضع کردہ آئین وقانون کس حد تک قرآنی ہوسکتا ہے؟ قرآنی آئین و شریعت صرف قرآن سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ جب ہم قرآن سے باہر جائیں گے تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں گے۔

وفیہا بصائر للناس

محجوب الارث

(علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

[علامہ اسلم جیراجپوری نے یہ مضمون ۱۹۱۵ء میں لکھا تھا جب وہ ہنوز حدیث اور فقہ کو بھی دین سمجھتے تھے۔ یہ مضمون پہلے رسالہ معارف، اعظم گڑھ میں ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد الگ رسالہ کی شکل میں۔ چونکہ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ ایک علمی اہمیت رکھتا ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس مضمون کو (جو اس وقت نایاب ہو رہا تھا) شائع کر دیں تاکہ اس مسئلہ کے تمام گوشے نکھر کر سامنے آجائیں۔ طلوع اسلام]

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الامین وعلی جمیع المسلمین الی یوم الدین۔ اما بعد

اسلامی فقہ فرائض میں ایک مسئلہ محجوب الارث کا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جو بیٹا باپ کی زندگی میں اپنے بچوں کو چھوڑ کر مر جاتا ہے اس کی یتیم اولاد اپنے دادا کے مرنے پر بشرطیکہ اس نے کوئی اور بیٹا بھی چھوڑا ہو اس کے ترکہ میں سے حصہ نہیں پاتی۔ مثلاً اگر مورث نے بروقت وفات ایک بیٹا اور ایک یتیم پوتا چھوڑا تو اس صورت میں سارے ترکہ کا مورث بیٹا ہو گا۔ اور پوتا محجوب الارث یعنی وراثت سے محروم قرار دیا جائے گا۔ صورت یہ ہے:

یہ حجب صرف اسی صورت میں محدود نہیں ہے بلکہ عصبات میں عام ہے مثلاً ایک بھائی کی موجودگی میں دوسرے مردہ بھائی کی اولاد یا چچا کے ہوتے ہوئے چچا زاد بھائی بہن وغیرہ سب اسی قاعدے سے محجوب ہیں۔

اس مسئلہ کو فقہا نے اگرچہ ایک مقرر اور طے شدہ قانون بنا کر فقہ کی کتابوں میں لکھ دیا ہے۔ لیکن پھر بھی دیکھا جاتا ہے کہ عام طور پر مسلمان اس سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں۔ خاصکر جب دوسرے اہل مذاہب اعتراض کرتے ہیں اور قانونِ اسلام کو یتیموں کے خاندان سے خارج کرنے کا الزام دیتے ہیں تو ان کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے اور کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے۔

حال میں دو ایک قانون پیشہ اصحاب محجوب پوتے کی وکالت کے لئے اٹھے بعضوں نے اس کی حمایت میں اخباروں میں مضامین بھی لکھے، قانون ساز مجلس میں بھی تحریک کی لیکن قدامت پرست جماعت کے مقابلہ میں بہت جلد نوفل کی طرح جس نے مجنوں کو بچانے کیلئے

لیلیٰ کے قبیلہ پر چڑھائی کی تھی ناکام میدان سے ہٹ گئے اور بیچارہ پوتا کہتا رہ گیا :

ہم دل میں خوش کہ سبزۂ تربت ہرا ہوا   وہ اس ادا سے روئے کہ پلکیں بھی نم نہیں

میرے دل میں ابتدا ہی سے جب سے میں نے فنِ وراثت کی تعلیم پائی یہ مسئلہ برابر کھٹکتا تھا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے ایک پھوپھی زاد بھائی حافظ عبدالاعلیٰ مرحوم جن کو بچپن ہی سے میرے ماں باپ نے تربیت اور تعلیم میں میرا ہمزاد بنا رکھا تھا اسی مسئلہ کا شکار تھے شیرخوارگی ہی کے زمانے میں ان کے والدین انتقال کر گئے تھے لیکن دادا زندہ تھے۔ اور ان کے اور بیٹے بھی تھے۔ بعد میں اگرچہ ان کے نیک دل دادا نے ان کی وراثت کیلئے باقاعدہ وصیت نامہ لکھدیا لیکن برادر مرحوم کی جوان مرگی نے ان سب جھگڑوں کا خاتمہ کر دیا۔

میری توجہ اسی زمانے سے اس مسئلہ کی طرف لگی رہی اور متعدد دلائل سے میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ یہ مسئلہ مغز و منشائے اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن یہ سوچکر کہ ممکن ہے میری فہم نے غلطی کی ہو ایک عرصۂ دراز تک ہندوستان کے مختلف اہل علم سے جو اس فن سے آشنا تھے اس مسئلہ کے متعلق خط و کتابت کرتا رہا جو مل گیا اس سے زبانی گفتگو کی۔ یہ سب لوگ میرے دلائل کے جوابات سے قطعاً قاصر رہے جس سے صاف روشن ہوگیا کہ یہ مسئلہ فقہ کی ایک ناقابل قبول غلطی ہے جس کی تقلید کسی طرح روا نہیں۔

اس بنا پر ۱۹۱۶ء میں میں نے اس بحث کو قلمبند کیا اور رسالہ معارف اعظم گڑھ کے جولائی اور اگست کے دو نمبروں میں شائع کرا دیا۔ صحیح الخیال علماء اور قانون پیشہ اصحاب جن کو رات دن معاملات سے واسطہ پڑتا ہے، میرے ساتھ موافقت کی اور صرف وہ لوگ جو فقہائے سابقین کے مقلد ہیں اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے اور ان کو ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ وہ ان کے دفاتر میں کسی غلطی کے قائل نہیں کہ اس کی تحقیق کریں اور جو قائل بھی ہیں تو اس زمانہ میں اس کی اصلاح ناممکن سمجھتے ہیں۔

محجوب الارث کا مسئلہ کوئی فرضی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اکثر مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔ میرے پاس چونکہ فرائض کے سوالات بہت آتے ہیں اس وجہ سے اس مسئلہ سے بھی کبھی کبھی واسطہ پڑ جاتا ہے۔

بعض دفعہ تو ایسی دردناک صورت پیش آگئی ہے کہ باپ کے سامنے وہی بیٹا اپنا کوئی معصوم بچہ چھوڑ کر مر گیا ہے جو اس کے بیٹوں میں سب سے زیادہ لائق اور خدمتگزار تھا۔ جس نے باپ کی خوب خدمت کی اور اپنی کمائی سے اس کو غنی کر دیا اور دوسرا بیٹا جو موجود ہے وہ نہایت نالائق اور ناکارہ ہے۔ پھر دادا کے مرنے کے بعد وہ یتیم بچہ جو اپنے باپ کے ظل عاطفت سے پہلے ہی محروم ہو چکا تھا اب اس کی پیدا کی ہوئی دولت سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور سارا ترکہ وہی ناکارہ اور آوارہ بیٹا لے لیتا ہے۔

میرے ایک دوست جو علی گڑھ میں نامور وکیل ہیں۔ ان کے یہاں ایک عورت چھوٹے چھوٹے چار بچوں کو نہایت خستہ اور تباہ حالت میں لئے ہوئے آئی اور رو رو کر اپنی دردبھری کہانی سنائی کہ سال گذشتہ طاعون میں میرا شوہر مر گیا، اب حال میں ان بچوں کا دادا بھی گذر گیا۔ ان کا ایک چچا ہی ہے جو نہایت نالائق اور آوارہ ہے، اس نے مجھے بچوں سمیت گھر سے نکال دیا، میرا میکہ اس قابل نہیں ہے کہ ان کو لیکر وہاں گزر کر سکوں، آپ وکیل ہیں۔ اللہ کے واسطے میری کچھ مدد فرمایئے اور بچوں کے دادا کی جائیداد میں سے جو بہت بڑی ہے عدالت سے چارہ جوئی کر کے کچھ ان کو دلایئے۔

وکیل صاحب کو رقت تو بہت آئی لیکن پھر اس کے کیا جواب دے سکتے تھے کہ افسوس ہے کہ تمہارے بچوں کو اسلامی قانونِ وراثت کی رو سے کچھ نہیں مل سکتا اس لئے عدالت میں دعویٰ کرنا فضول ہے۔

آخر وہ بیچاری باچشم تر ان نیم مردہ معصوموں کو لیکر واپس چلی گئی۔

جب اس قسم کی پیش آنے والی کوئی صورت نظر پڑتی ہے تو لوگ یہ کوشش[1] کرتے ہیں کہ دادا اپنی زندگی میں محجوب اولاد کو کچھ دیدے کیونکہ چچاؤں سے امید کم ہوتی ہے اور چونکہ فطرت نے اولاد پر شفقت کرنے کا مادہ انسان میں رکھا ہے، اس لئے اکثر حالتوں میں دادا راضی ہو جاتے ہیں اور ان یتیموں کا تبرعاً و احساناً اپنے مال میں سے کچھ حصہ دیدیتے ہیں۔

لیکن بعض سخت دل ایسے بھی ہوتے ہیں جو صاف صاف کہدیتے ہیں کہ صاحب جب ان کو اللہ نے نہیں دیا تو ہم دینے والے کون؟ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قانونِ وراثت کے مکمل ہونے کا دعویٰ جو کیا جاتا ہے وہ کہاں تک بجا ہے کہ ایک بیکس و یتیم بچہ اپنے بزرگوں کی زندگی بھر کی کمائی سے محروم ہو رہا ہے اور کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی۔

اسلئے کہ ایک طرف تو قانونِ وراثت اس کو محجوب الارث قرار دیتا ہے اور دوسری طرف خفہ دادا کے اوپر اس کے لئے کوئی وصیت بھی فرض نہیں کرتی۔

اس صورت کو پیش نظر رکھکر یہ بھی سوچنا چاہئے کہ یہ قانون اس شفقت کے کہاں تک مطابق ہے جو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنی چاہتا ہے اسلام تو سراسر رحم و مہربانی ہے، ہمارے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم دنیا والوں کیلئے رحمت اور بالخصوص یتیموں اور بیکسوں کیلئے شفیق والدین سے بڑھ کر تھے، آپ دنیا میں خود یتیم پیدا ہوئے تھے اور ابتدا ہی سے یتیموں سے اسقدر محبت اور الفت رکھتے تھے کہ جب مکہ معظمہ کی گلیوں سے گزرتے تھے تو یتیم بچے اپنی دولت سمجھ کر دوڑ دوڑ کے قدموں سے لپٹ جاتے تھے۔

چنانچہ آپ کے چچا نے آپ کی مدح میں جو اشعار کہے تھے ان میں سے ایک شعر یہ تھا۔

وابیض یستسقی الغمام بوجهه ۔۔۔ ثمال الیتامی عصمة للارامل

ترجمہ: نورانی چہرہ والا جس کی برکت سے باران طلب کی جاتی ہے، یتیموں کا سرپرست اور بیواؤں کا نگہبان۔

تقریباً اسی مضمون کو مولانا حالی مرحوم نے اس بند میں باندھا ہے۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا ۔۔۔ مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کی کام آنے والا ۔۔۔ وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، یتیموں کا ماویٰ ۔۔۔ ضعیفوں کا حامی، غریبوں کا مولیٰ

کسی دوسرے ملک میں شاید یہ قانون اس قدر مضرت رساں نہ ثابت ہو جسقدر کہ ہندوستان میں ہے اسلئے کہ یہاں مسلمانوں میں بھی ایک قسم کے خاندان مشترکہ کا رواج ہے یعنی پشتہا پشت تک لوگ ایک ساتھ رہ کر زندگیاں گزارتے ہیں اور بیٹوں کی جو کچھ کمائی ہوتی ہے

---

[1] بعض مولوی اس کوشش کی بھی مخالفت کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں اس سے حقداروں کا حق زائل ہوتا ہے۔

وہ جب تک باپ زندہ رہتا ہے، اسی کی ملکیت میں منضم ہوتی جاتی ہے۔

اب اگر اتفاق سے کوئی بیٹا باپ کی زندگی ہی میں اپنا بچہ چھوڑ کر مرجاتا ہے تو چونکہ اس کی کوئی جداگانہ ملکیت قائم نہیں ہوتی اسلئے اس کا کچھ ترکہ ہی نہیں قرار پاتا اور سارا مال و منال بچہ کے دادا کے قبضۂ تصرف میں رہتا ہے، پھر جب دادا مرتا ہے تو دوسرے حصہ دار بیچ میں آکر حائل ہوجاتے ہیں، جن کی وجہ سے وہ یتیم بچہ محجوب قرار پاجاتا ہے اور خود اس کے باپ کے گاڑھے خون کی کمائی دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔

اب ہم اس مسئلہ پر تفصیلی بحث شروع کرتے ہیں جس سے اس کی پوری حالت منکشف ہوجائے گی اور معلوم ہوجائے گا کہ آیا یتیم اولاً حقیقت میں محجوب ہے بھی یا نہیں۔ ہم جہاں تک غور کرتے ہیں قرآن، اور حدیث تو خیر خود فقہ بھی اصولاً ان کو محجوب نہیں کرتی ہے۔

فقہاء نے حجب حرماں کو صرف دو اصول پر مبنی قرار دیا ہے۔

(۱) جو شخص مورث کے ساتھ کسی دوسرے شخص کے واسطہ سے رشتہ رکھتا ہے وہ اس وقت تک وراثت نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ درمیانی شخص موجود ہے۔

(۲) الاقرب فالاقرب یعنی قریب کا رشتہ دار دور کے رشتہ دار کو محروم کرتا ہے۔ اصل الفاظ سراجی کے یہ ہیں:-

رھو (حجب الحرمان) مبنی علی اصلین احدھما ان کل من یدلی الی المیت بشخص لا یرث مع وجود ذالک الشخص والثانی الاقرب فالاقرب۔

حجب حرماں دو اصول پر مبنی ہے، پہلا یہ کہ جو شخص میت سے کسی کے واسطے سے قرابت رکھتا ہے تو اس واسطہ کی موجودگی میں وارث نہیں ہوگا اور دوسرا الاقرب فالاقرب ہے۔

پہلا قاعدہ جس کو مختصر لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں ——— واسطہ کی موجودگی میں ذی واسطہ وارث نہیں ہوتا ——— یتیم پوتے کو کسی طرح محروم نہیں کرتا، اسلئے کہ پوتے کو دادا کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ بواسطہ اپنے باپ کے ہے۔ اور جب باپ جو واسطہ تھا موجود ہی نہیں ہے تو پھر پوتا کیوں محروم ہونے لگا۔

دوسرا قاعدہ الاقرب فالاقرب ہے اسی میں غلط فہمی واقع ہوئی ہے، اس کے ظاہری معنی خیال کرکے لوگوں نے یہ سمجھا کہ بیٹا جو قریبی رشتہ دار ہے، یتیم پوتے کو جو اس سے دور کا رشتہ دار ہے محجوب کردے گا۔

در اصل یہی اور صرف یہی ایک قاعدہ ہے جس کی بنیاد پر یتیم اولاد محجوب قرار دی جاتی ہے۔ لہٰذا ہم اپنی بحث کا مرکز بھی اسی قاعدہ کو قرار دیتے ہیں ——— اگر یہ قاعدہ الاقرب فالاقرب اپنے ظاہری معنوں میں رکھا جائے یعنی یہ کہ مطلقاً درجہ کے لحاظ سے جو قریب ہو وہ بعید کو محروم کردے تو وراثت کے بہت سے مسلہ اور اجماعی مسائل ٹوٹ جائیں گے۔

مثال نمبر ۱

	زید	مسئلہ ۲
	دادا	بیٹا
	۱	۵

اس مثال میں بیٹے کی موجودگی میں دادا کو حصہ ملا ہے، حالانکہ بیٹا میت سے بہ نسبت دادا کے اقرب ہے، کیونکہ بیٹا بلا واسطہ اس سے رشتہ رکھتا ہے اور دادا بواسطہ باپ کے اس کا رشتہ دار ہے۔

مثال نمبر ۲

	زید	مسئلہ ۶	
باپ		بیٹا	پڑنانی
۱		۴	۱
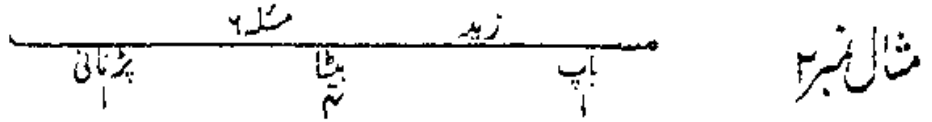
یہاں بیٹے اور باپ کے ہوتے ہوئے پڑنانی حصہ لے گئی جو نہایت دور کی رشتہ دار ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اسی پر تعجب تھا کہ بھتیجا پھوپی کا وارث ہوتا ہے اور پھوپھی بھتیجے کی وارث نہیں ہوتی، لیکن اگر موجودہ فقہ اُن کے سامنے ہوتی تو ان کو اور بھی حیرت ہوتی کہ نانی بلکہ پڑنانی تک تو نواسے کے ترکہ میں سے حصہ پاتی ہے اور نواسا ان میں سے کسی کا بھی ترکہ نہیں[1] پاتا۔ دادا محجوب الارث پوتے کا وارث ہوتا ہے اور محجوب الارث پوتا دادا کا وارث نہیں ہوتا۔

مثال نمبر ۳

	زینب مسئلہ ۶			
شوہر	ماں	دو اخیافی بھائی	دو حقیقی بھائی	دو علاتی بھائی
۳	۱	۲	محروم	محروم
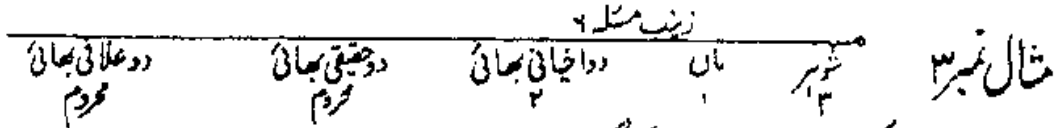
اس مثال میں کسی قاعدہ کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

حجب حرمان کا پہلا قاعدہ یہ چاہتا تھا کہ دونوں مادری بھائی جو ماں کے واسطہ سے رشتہ رکھتے ہیں اس کی موجودگی میں محروم ہوں لیکن نہیں ہوئے۔

دوسرا قاعدہ بھی یہی چاہتا تھا کہ ماں جو قریبی رشتہ دار ہے۔ مادری بھائیوں کو محروم کردے لیکن نہیں کرسکی۔

حقیقی اور علاتی بھائی جو قوت قرابت کے لحاظ سے اقوی اور اقرب تھے وہ بھی اخیافیوں کو نہیں محروم کرسکے بلکہ ان کی وجہ سے اُلٹے خود محروم ہوکر کہنے لگے۔

یہاں ہم بدنصیبوں کے جو حصہ میں نہیں آتی   الٰہی رہ گئی کیا خوبیٔ قسمت وہیں بن کر

دنیا میں کون شخص ہے جو کہہ سکتا ہے کہ حقیقی بھائیوں کو محروم کرکے اخیافی بھائیوں کو حصہ دیدینا جو زیادہ تر اپنے کنبہ کے بھی نہیں ہوتے کسی معقول اصول وراثت پر مبنی[3] ہے۔

---

[1] چنانچہ کنز العمال میں ہے کہ وہ پھوپی اور خالہ کو محروم نہیں کرتے تھے۔

[2] تعجب پر تعجب یہ ہے کہ ماں جو کمتر وارث ہے وہ تو دادی کو محروم کردیتی ہے اور باپ جو قوی وارث ہے نانی کو نہیں محروم کرسکتا۔

[3] اصل بنیاد اس کی یہ ہے کہ اس آیت میں "وان کان رجل یورث کلالۃ او امرأۃ ولہ اخ او اخت" ابی بن کعبؓ کی قرأت کے مطابق اخ او اخت کے بعد "لام" کا اضافہ کرکے ہمارے اخیافیوں کو ذوی الفروض میں داخل کردیا، اس لئے حقیقیوں سے جو عصبہ ہیں ان کا حق مقدم ہوگیا لیکن اس آیت کے جو معنی قرار دیئے گئے ہیں وہ بوجوہ ذیل ٹھیک نہیں

(۱) ابی بن کعبؓ جن کی قرأت کے مطابق حوذتین قرآن سے خارج ہیں ان کے "لام" قرأت کی روایت جہاں تک ہم کو معلوم ہے، بیہقی نے لکھی ہے جن کی تصنیفات کتب حدیث میں طبقہ ادنیٰ کی ہیں۔ (باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

یہ سوچنے کی بات ہے کہ جس رشتہ سے اخیافی وارث بنائے گئے ہیں حقیقیوں میں اگر باپ کے رشتہ کا نہ بھی خیال کیا جائے تو کم سے کم وہ رشتہ تو ضرور موجود رہے پھر ان کو محروم کرنے کے کیا معنی۔ چنانچہ امام مزنی کی کتاب المختصر میں ہے کہ اس صورت میں حضرت عمرؓ حقیقیوں کو محروم نہیں کرتے تھے۔

خود فقہا بعض جگہ دو قرابت والوں کو ایک قرابت والے سے اقوی قرار دیکر حصہ دلاتے ہیں، لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

مثال نمبر ۴

زید مسئلہ ۱۸

دو بیٹیاں	دو پوتیاں	پڑپوتی	سکڑپوتی	سکڑپوتا
۱۲	۲	۱	۱	۲

اس صورت کو فقہا مسئلہ تشبیب کہتے ہیں۔ اس میں بیٹیاں اقرب ہیں۔ ان کی موجودگی میں نیچے والیوں کو محروم ہونا چاہئے تھا۔ لیکن بخلاف اس کے پوتی، پڑپوتی، سکڑپوتی، سکڑپوتا جو سب نیچے اوپر مختلف درجہ کے ہیں آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بہن قرار دیئے گئے اور سب کو ترکہ میں سے حصہ مل گیا۔ لیکن ایک بدبخت یتیم پوتا ہی ہے جو اپنے باپ کی عدم موجودگی میں اس کے بجائے اپنے چچا کا بھائی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

لب شکرستاں وادحشمت مے بہ میخواراں   منم کز غایت حرماں نہ با آنم نہ با اینم

ان متعدد اور مختلف قسم کی مثالوں سے صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ قاعدہ الاقرب فالاقرب اپنے ظاہری معنی میں یعنی یہ کہ مطلقاً درجہ کے لحاظ سے جو قریب ہے وہ بعید کو محروم کر دے نہیں لیا جا سکتا ورنہ تمام اعتراضات مذکورہ وارد ہوتے ہیں۔

ان اعتراضات سے بچنے کیلئے یہ جواب دیا گیا کہ یہ قاعدہ یعنی الاقرب فالاقرب صرف عصبات میں ہے ذوی الفروض میں جاری نہیں ہوتا۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) (۲) یہ قرأۃ بمقابلہ قرأۃ متواترہ کے بالاتفاق تمام امت کے نزدیک نامقبول ہوئی، اور کسی نے کلام نہیں پڑھا۔ لہذا اس سے استدلال کرنا اس کو ایک ساتھ ہی نامقبول اور مقبول دونوں قرار دینا ہے۔

۳۔ فقہا اور مفسرین "لہٗ" کی واحد مذکر غائب کی ضمیر کو رجل اور امرأۃ دونوں کی طرف راجع کرتے ہیں جن میں سے امرأۃ مونث حقیقی ہے وہ کبھی اس کا مرجع ہو ہی نہیں سکتی، اس صورت میں لھما، یا لکل واحد منہما چاہئے تھا۔

۴۔ توریث کلالہ والی آیت میں جو آخر سورہ میں ہے اخ اور اخت کے الفاظ بعینہٖ ہی ہیں۔ اب اگر دونوں آیتیں انہیں کی توریث کے متعلق قرار دی جائیں تو دونوں کو ناقص کہنا لازم آتا ہے یعنی اس آیت میں "لاُمّ" کا لفظ اور اس میں لاَب وامّ یا لاَب بڑھانا پڑے گا۔ حالانکہ اس کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔

۵۔ اگر اس آیت سے اخ اور اخت کی توریث مقصود بھی تو کیوں اللہ تعالیٰ نے لاُمّ نہیں فرمایا۔ وہ خود کہتا ہے "وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا" تفسیر کے موقع پر ابہام کلام کے نقائص میں سے ہے جس سے قرآن بہت بالاتر ہے۔ آیت کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں: "اگر کوئی مرد کسی کلالہ کا وارث بنایا جائے یا کوئی عورت۔ بحالیکہ اس کلالہ کے کوئی بھائی یا بہن ہو تو اس مرد یا عورت میں سے ہر ایک کو ایک ایک سدس ملے گا۔

"لہٗ" کی ضمیر کا مرجع کلالہ ہے۔ اور "لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا" میں تثنیہ کی ضمیر رجل وامرأۃ کی طرف راجع ہے نہ کہ اخ واخت کی طرف۔ یورث باب افعال سے ہے مجرد سے نہیں ہے۔

اس آیت میں بھائی اور بہن کا حصہ قطعاً نہیں بیان کیا گیا بلکہ عہدی رشتہ داروں کا ہے بھائی اور بہن کا ذکر صرف اس وجہ سے آگیا ہے کہ یہ والدین اور اولاد کی طرح عہدی رشتہ داروں کو محروم نہیں کرتے بلکہ ان کی موجودگی میں بھی وہ وارث ہو سکتے ہیں۔ (مزید تفصیل کیلئے ہماری کتاب الوراثۃ فی الاسلام

لیکن پھر اس پر بھی اعتراضات پڑتے ہیں کہ اچھا بالفرض اگر یہ قاعدہ صرف عصبات میں ہے اور ذوی الفروض میں نہیں ہے تو جدات جو ذوی الفروض ہیں ان میں قریب بعید کو کیوں محروم کرتی ہے، چنانچہ سراجی میں ہے۔

والقربیٰ من ای جہۃ کانت تحجب البعدیٰ من ای جہۃ کانت

جدہ قریبہ خواہ کسی طرف کی ہو جدہ بعیدہ کو خواہ کسی طرف کی ہو محجوب کردیگی۔

نیز بیٹیاں پوتیوں کو اور حقیقی بہنیں جب ذوی الفروض ہوتی ہیں تو علاتی بہنوں کو کس قاعدہ سے محروم کرتی ہیں؟

ان اعتراضات سے مجبور ہو کر پھر فقہاء نے تسلیم کیا کہ الاقرب فالاقرب کا قاعدہ ذوی الفروض میں بھی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جن رشتہ داروں کی وراثت کا سبب متحد ہے ان میں قریب بعید کو محجوب کرتا ہے یعنی ماں، نانی، پڑنانی، دادی، پڑدادی، ان سب کے وارث ہونے کا سبب "امومت" ہے جو سب میں یکساں پایا جاتا ہے، اس لئے ان میں سے جو قریب ہوگی وہ بعید کو محروم کردیگی۔

نیز بیٹیوں اور پوتیوں میں بھی سبب وراثت متحد ہے یعنی "بنتیت" اس وجہ سے بیٹیوں کی موجودگی میں پوتیاں محروم ہو جائیں گی۔

علیٰ ہذا حقیقی بہنیں بھی بوجہ اتحاد سبب وراثت اور قرب کے علاتی بہنوں کو محجوب کردیں گی۔

یہاں تک کہ فقہاء اس بحث کو ختم کردیتے ہیں اور گویا یہ قاعدہ دوم یعنی الاقرب فالاقرب ان کے خیال میں اپنی جگہ پر مضبوط اور مستحکم ہوگیا لیکن ابھی اعتراضات اور باقی ہیں اور بلا ان کے جوابات دیئے ہوئے یہ عقدہ مشکل حل نہیں ہو سکتا۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ اتحاد سبب وراثت محض تمہاری خیالی توجیہ ہے، اس کو ہم تسلیم نہیں کرتے اور حقیقت یہ ہے کہ اسی قسم کی بے بنیاد توجیہات سے اس فن میں خرابیاں واقع ہوگئی ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اتحاد سبب وراثت کو جب ترکہ دلانے میں دخل نہیں ہے تو محروم کرنے میں کیسے داخل ہوگیا۔ مثال نمبر ۳ میں اخیافی بھائیوں میں جو سبب وراثت پانے کا ہے وہی حقیقیوں میں بھی موجود ہے، پھر بھی حقیقی محروم کئے گئے، اور اخیافیوں کو ترکہ دیا گیا۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اتحاد سبب وراثت کو حجب حرمان میں اگر کوئی دخل ہے تو پھر ذوی الفروض ہی کے ساتھ اس کو کیا خصوصیت ہے۔ عصبات میں بھی یہی شرط لگانی چاہئے۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ بالفرض ہم نے آپ کے اس مشروط قاعدہ کو تسلیم بھی کرلیا کہ ذوی الفروض میں الاقرب فالاقرب کا قانون اس وقت جاری ہوگا جب ان میں سبب وراثت متحد ہو گا لیکن مندرجہ ذیل مثالوں میں یہ قاعدہ ٹوٹ جاتا ہے۔

مثال نمبر ۱ — زید مسئلہ ۶

بیٹی	پوتی	بھتیجا
۳	۱	۲

یہاں بیٹی اور پوتی کا سبب وراثت متحد ہے اور وہ دونوں ذوی الفروض میں سے ہیں، پھر بھی بیٹی نے جو اقرب ہے پوتی کو محروم نہیں کیا۔

مثال نمبر ۲ — زید مسئلہ ۶

حقیقی بہن	علاتی بہن	بھتیجا
۳	۱	۲

اس صورت میں بھی حقیقی اور علاتی بہنوں کی وراثت کا سبب متحد ہے اور دونوں ذوی الفروض ہیں، چاہیے تھا کہ حقیقی علاتی کو بوجہ اقرب ہونے کے محجوب کرتی۔

علاوہ بریں عصبات میں جہاں آپ نے قاعدہ الاقرب فالاقرب کو بلا کسی قید کے رکھا ہے وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود اتحاد سبب وراثت کے بھی قریب بعید کو محجوب نہیں کرتا۔ مثلاً مسئلہ تشبیب کو لیجئے جو مثال نمبر ۴ میں دکھلایا گیا ہے اس میں پوتی، پڑوتی، سکڑوتی سب کے وارث ہونے کا سبب متحد ہے بلکہ چونکہ وہ سب کی سب سکڑنے کی وجہ سے عصبہ بنائی گئی ہیں اس وجہ سے ان کے عصبہ ہونے کا بھی سبب ایک ہی ہے، پھر بھی ان میں قریب نے بعید کو محجوب نہیں کیا اور سب کو ایک ہی درجہ میں رکھکر یکساں حصہ دیا گیا۔

اسی طرح جب عصبہ اور ذوی الفروض کا باہم اجتماع ہوتا ہے تو کہیں فقہا اس قاعدہ کو جاری کرتے ہیں اور کہیں نہیں کرتے، بیٹا عصبہ کے ساتھ پوتی صاحبۂ فرض محروم ہو جاتی ہے لیکن باپ عصبہ کے ساتھ نانی صاحبۂ فرض محروم نہیں ہوتی۔

الغرض یہ صاف روشن ہو گیا کہ الاقرب فالاقرب کا قاعدہ جس معنی میں فقہا نے استعمال کیا ہے کسی تاویل سے ٹھیک نہیں ہوتا بلکہ ہر پہلو سے خود انھیں کے مسلمات سے ٹوٹ جاتا ہے، لہذا ایسے غیر مسلم قاعدے سے یتیم اولاد کو محجوب کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ الاقرب فالاقرب کے قاعدے میں اقرب کا ظاہری مفہوم اگر مراد لیا جائے یعنی یہ کہ مطلقاً درجے کے لحاظ سے جو قریب ہو وہ بعید کو محجوب کر دے تو یہ قاعدہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، یہاں اقرب سے بجز اس کے کچھ مراد نہیں لیا جا سکتا کہ:

اقرب وہ رشتہ دار ہے جو بلا واسطہ مورث سے رشتہ رکھتا ہو یا با واسطہ لیکن بروقت وفات مورث کے وہ واسطہ موجود نہ ہو۔

جس طرح کہ میت کے مرنے کے وقت اگر اس کا باپ موجود نہیں ہے تو دادا بجائے باپ کے رکھا جاتا ہے اس لئے کہ بیچ میں جو واسطہ تھا یعنی باپ جس کی وجہ سے دادا محجوب ہو جاتا تھا وہ نہیں ہے، لہذا دادا اس واسطہ کی عدم موجودگی سے خود اقرب ہو گیا اور اب کوئی اقرب خواہ وہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو دادا کو محجوب نہیں کر سکتا۔

اسی طرح مورث کی وفات کے وقت اگر اس کا کوئی یتیم پوتا ہے تو وہ اپنے متوفی باپ کی جگہ رکھا جائے گا اور وہی حصہ لے گا جو اس کے باپ کا تھا، مورث کا جو بیٹا موجود ہے وہ اس کو محجوب نہیں کر سکتا۔ اسلئے کہ واسطہ کی عدم موجودگی سے وہ خود اقرب ہو گیا ہے۔

تعجب ہے کہ دادا کے معاملہ میں تو فقہا اقرب کا یہی مفہوم لیتے ہیں لیکن پوتے کے معاملے میں نہیں۔ پوتے کی بدنصیبی کے سوا اور اس کی کوئی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

من ازیں طالع شورہ بر نجسم ورنہ بہرہ مند از سر کویت دگرے نیست کہ نیست

حقیقت یہ ہے کہ وراثت کا سارا دارومدار قائم مقامی پر ہے۔ لہذا جس بچہ کا باپ مر گیا ہے وہ وراثت میں اس کا قائم مقام سمجھا جائے گا۔ فقہا نے اس مسئلہ میں اسی اصل نکتہ یعنی قائم مقامی کا لحاظ نہیں رکھا جس کی وجہ سے ایسی عظیم الشان غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ یتیم بچوں کو محجوب کرنے لگے۔ یہ امر غور کے قابل ہے کہ جس بیٹے کی موجودگی کی وجہ سے یتیم پوتے کو فقہا محجوب قرار دیتے ہیں وہ بیٹا صرف ایک ہی طرف سے کیوں حاجب ہوتا ہے یعنی صرف پوتے ہی کو دادا کے ترکہ سے کیوں محجوب کرتا ہے، دادا کو اس پوتے کے ترکہ سے کیوں نہیں محجوب کرتا

بلکہ دادا کی وجہ سے الٹا خود ہی محروم ہو جاتا ہے اس سے صاف نمایاں ہو جاتا ہے کہ قائم مقامی کے اصول پر وہ کسی طرح پوتے کا حاجب نہیں ہو سکتا۔

حاصل یہ کہ اقرب کا سوائے اس کے جو ہم نے اوپر لکھا ہے اور کوئی مفہوم ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی معنی لینے سے الاقرب فالاقرب کا قاعدہ جو تقسیم وراثت میں اصل الاصول اور بنیادی قانون ہے اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھ جاتا ہے۔

محجوب پوتے کو وارث بنانے پر ظاہر ہیں جو شبہات ہو سکتے ہیں ہم ان کو خود ہی لکھ کر ان کے جوابات بھی دیتے ہیں تاکہ اس مسئلہ کی اچھی طرح توضیح ہو جائے۔

شبہ اول: محجوب پوتے کو قرآن کریم کی رو سے کیسے ترکہ دیا جا سکتا ہے اس میں تو کہیں پوتے کا ذکر نہیں صرف اولاد کا لفظ ہے جس کے معنی بیٹا بیٹی کے ہیں۔

جواب: اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ غیر محجوب پوتوں کو فقہا بھی تو ترکہ دلاتے ہیں پس جو آیت ان کی وراثت کی دلیل قرار دی جائیگی وہی ہماری بھی دلیل ہوگی۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ اولاد کا لفظ جو قرآن میں ہے اس کے معنی صرف بیٹا بیٹی کے نہیں ہیں بلکہ نیچے تک تمام اولاد اس میں داخل ہے تفسیر خازن میں آیت "ولھن الربع مما ترکتم" کے ذیل میں لکھا ہے:-

اسم الولد یطلق علی الذکر والانثی ولا فرق بین الولد وولد الابن وولد البنت فی ذلک

ولد کا لفظ مذکر و مؤنث دونوں کیلئے بولا جاتا ہے اور اس میں اولاد اور بیٹے کی اولاد اور بیٹی کی اولاد میں کوئی فرق نہیں۔

فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد ۱۲ صفحہ ۸ مطبوعہ مصر میں ہے:-

الولد اعم من الذکر والانثی ویطلق علی الولد الصلب وعلی ولد الولد وان سفل۔

ولد کا لفظ مذکر اور مونث دونوں سے عام ہے اور صلبی اولاد اور نیچے تک اولاد کی اولاد پر بولا جاتا ہے۔

فقہا بھی اس کے ساتھ متفق ہیں اور ولد میں ولد الابن کو داخل سمجھتے ہیں۔ شریفیہ شرح سراجی صفحہ ۲۶ مطبوعہ مطبع یوسفی لکھنو میں ہے۔

ولد الابن داخل فی الولد لقولہ تعالٰی یا بنی آدم

اولاد میں بیٹے کی اولاد بھی داخل ہے کیونکہ ہم کو اللہ تعالٰی نے بنی آدم کہا ہے۔

آیت توریث میں جہاں جہاں بھی ولد کا لفظ آیا ہے ہر جگہ بالاتفاق فقہا نے نیچے تک تمام اولاد نر و مادہ کو اس میں داخل سمجھا ہے۔ مثلاً

فان کان لھن ولد فلکم الربع مما ترکن

اگر ان کی (تمہاری بیویوں کی) کوئی اولاد ہو تو ان کے ترکہ میں سے تم کو چوتھائی ملیگا۔

فقہا میں سے ایک نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ بیویاں جب صلبی بیٹا یا بیٹی چھوڑ کر مریں اسی وقت شوہروں کو چوتھائی ملے گا بلکہ سب کا اتفاق ہے کہ وہ پوتا، پوتی، پڑپوتا، پڑپوتی کسی کو بھی اگر چھوڑیں تو شوہر کو چوتھائی ملے گا۔

اولاد تو پھر بھی ایک عام لفظ ہے، ابن و بنت کے الفاظ جو عربی زبان میں خاص بیٹا بیٹی کے لئے وضع کئے گئے ہیں وہ بھی قرآن میں کئی جگہ وسیع معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں، اور نیچے تک کی تمام اولاد کو شامل ہیں، جا بجا اللہ تعالیٰ نے ہم کو "یا بنی آدم" کہکر خطاب کیا ہے بیسیوں نسلیں حضرت یعقوب کی گزر گئی تھیں لیکن ان کی اولاد قرآن میں یا بنی اسرائیل کہہ کر پکاری گئی۔

دور کیوں جائیے خود آیت وراثت ہی کے ایک رکوع کے بعد ہے، حرمت علیکم امھاتکم وبناتکم، یہاں بنات کے لفظ کو تمام فقہا نے بیٹیوں، پوتیوں، پڑپوتیوں، یہاں تک کہ نواسیوں پر بھی شامل تسلیم کیا ہے، اس لئے آیت وراثت میں جو اولاد کا لفظ ہے اس میں یقیناً پوتا داخل ہے اور کسی طرح خارج نہیں ہوسکتا۔

اور یہ مجازاً نہیں ہے بلکہ حقیقتاً ہے، جیسا کہ علامہ ابوبکر ابن العربی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے۔ کیونکہ ولد کا لفظ ولادت سے مشتق ہے، اسلئے اولاد کی اولاد بھی حقیقتاً اولاد ہے جس طرح کہ جز کا جز بھی یقیناً جز ہے۔

شبہ دوم: جب محجوب پوتے کو وراثت دلائی جاتی ہے تو پھر سب پوتے برابر ہیں، ہر ایک کا رشتہ دادا کے ساتھ یکساں ہے۔ لہٰذا صرف وہی پوتا کیوں دادا کا ترکہ پائے جس کا باپ دادا سے پہلے مرگیا ہے، وہ پوتے بھی کیوں نہ وارث ہوں جن کے باپ موجود ہیں۔

جواب: جن پوتوں کے باپ موجود ہیں، اصل میں محجوب وہی پوتے ہیں، کیونکہ ان کے باپ خود ان کے اور ان کے دادا کے درمیان حاجب ہیں، نہ وہ دادا کا ترکہ پوتے کو پہنچنے دیتے ہیں اور نہ پوتے کا ترکہ دادا کو بلکہ دونوں طرف سے بیچ میں خود ہی وارث بن جاتے ہیں اسلئے وہ پوتے جن کے باپ موجود ہیں دادا کے مرنے پر اقرب نہیں ہوسکتے، بخلاف اس پوتے کے جس کا باپ مرگیا ہے کیونکہ واسطہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ دادا کا اقرب ہوجائے گا اسلئے وارث ہوگا۔

بعینہ اس کی مثال ایسی ہے جس طرح کوئی شخص نانی، دادی، اور باپ کو چھوڑ کر مرجائے، ظاہر ہے کہ دادی کو میت کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ کسی طرح نانی کے رشتہ سے کم نہیں ہے، لیکن بوجہ اس کے کہ باپ درمیان میں حاجب موجود ہے دادی محجوب ہوجاتی ہے اور نانی حصہ پاجاتی ہے کیونکہ نانی اور مورث کے درمیان کوئی حاجب موجود نہیں ہے۔

شبہ سوم[1]: بیٹا اور پوتا دونوں عصبہ ہیں اور عصبات میں یہ قاعدہ ہے کہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ "اولی رجل ذکر" یعنی قریب ترین مرد نر کو دیا جاتا ہے اسلئے بیٹے کے ہوتے ہوئے اس قانون کی رو سے یتیم پوتے کو کچھ نہیں ملے گا۔

جواب: اگر عصبات میں "اولی رجل ذکر" کو آپ بطور قانون کلی کے قرار دیتے ہیں تو خود کیوں اس کو جا بجا توڑتے ہیں، مثلاً

بھتیجا	بہن	دو بیٹیاں
محروم	۱	۲

اس مثال میں بیٹیاں ذوی الفروض ہیں، ان کو دو ثلث دینے کے بعد جو کچھ بچا تھا وہ اس قاعدہ کی رو سے بھتیجے کو جو اقرب ترین مرد نر ہے ملنا چاہئے تھا، لیکن وہ تو محروم کردیا گیا، اور بہن جو زن مادہ ہے بقیہ کی وارث ہوگئی۔

---

[1] یہ شبہ علمائے اہل حدیث کی طرف سے کیا گیا ہے۔

علیٰ ہذا مسئلہ تشبیب یعنی مثال نمبر ۲ کو دیکھئے اس میں مرد بزاد اور زن مادہ سب کو ایک ساتھ وارث بنایا گیا ہے کیا قانون کلی ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جو قدم قدم پر ٹوٹ جایا کریں؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث "الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھی لاولی رجل ذکر" ذوی الفروض کو ان کے حصے دیکر بقیہ قریب ترین مرد کو دیدو" کسی خاص مسئلہ کے متعلق فرمائی گئی ہے۔ مثلاً یہ صورت فرض کیجئے کہ کوئی شخص ماں، بیٹی، باپ، چچا اور بھائی کو چھوڑ کر مرگیا اس کے بارہ میں یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ ذوی الفروض کے حقوق دیکر جو کچھ بچے قریب ترین مرد کو دیدو لیکن اس کو ایک عام اصولی قرار دے لینا صریحاً قرآن کے منافی ہے۔

مثال نمبرا — زید مسئلہ ۶ — ۱۸

ماں	بیٹی	بیٹا
۳	۵	۱۰

یہاں ماں کو ایک سدس دینے کے بعد آپ کے اس قانون کلی کے مطابق بقیہ پانچ سدس بیٹے کو ملنا چاہئے لیکن قرآن مجید اس کے برخلاف اس صورت میں بیٹا اور بیٹی دونوں کو وارث بناتا ہے اور بیٹے کا نصف بیٹی کو دلاتا ہے۔

زید مسئلہ ۶ — ۱۸

ماں	بیٹی	بہن	بھائی
۳	۹	۲	۴

اس صورت میں ماں اور بیٹی جو ذوی الفروض ہیں ان کا حصہ دینے کے بعد بقیہ بھائی کو ملنا چاہئے تھا کیونکہ وہ" اولیٰ رجل ذکر" ہے لیکن قرآن کریم بھائی اور بہن دونوں میں للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق ترکہ تقسیم کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اب سوچئے کہ یہ حدیث جس کی صحت پر تمام اہل سنت متفق ہیں قانون کلی قرار دینے سے ان کے خلاف پڑتی ہے اور غلط ہوئی جاتی ہے اس لئے یقیناً یہ کسی خاص مسئلہ ہی کے متعلق ہو سکتی ہے۔

یہاں ایک امر اور غور کے قابل ہے کہ آپ جہاں اس کو قانون کلی قرار دیتے ہیں کہ بقیہ" اولیٰ رجل ذکر" کو ملنا چاہئے۔ وہاں اس حدیث کو بھی قانون کلی ہی سمجھتے ہیں کہ" اجعلوا الاخوات مع البنات عصبۃ" بہنوں کو بیٹیوں کے ساتھ عصبہ بنادو۔

اس مثال نمبر ۲ میں بتائیے تو سہی کہ آپ نے اپنے ان دونوں کلی قوانین میں سے کس پر عمل کیا ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ بیٹیوں کے ساتھ بہنوں کو بھی حصہ مل سکتا ہے۔ یہانتک کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ اولاد کے ساتھ بہنوں کو وارث بناتے ہیں وہ آئیں ہم ان کے ساتھ مباہلہ کیلئے تیار ہیں کہ جھوٹے پر اللہ کی لعنت ہو۔

شبہ چہارم: صحیح بخاری کتاب الفرائض میں ہے۔ ولا یرث ولد الابن مع الابن۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وراثت نہیں پاتا۔

جواب: اس جملے کے معنی تو یہ ہوئے کہ" بیٹے کی اولاد خود اس بیٹے کی موجودگی میں وراثت نہیں پاتی"۔ اسلئے کہ اس جملہ میں

دونوں جگہ لفظ ابن پر الف لام تعریف کا ہے اور اصول فقہ میں یہ قاعدہ مقرر ہے کہ ایسی صورت میں دونوں سے مراد ایک ہی ذات ہوتی ہے، چنانچہ نورالانوار میں ہے :۔

المعرفة اذا اعيدت كانت الاولى عين الثانية

معرفہ جب دوبارہ لایا جائے گا تو پہلا بعینہ دوسرا ہوگا۔

چنانچہ اسی بنیاد پر اس میں لکھا ہے کہ اس آیت میں

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا

یقیناً دشواری کے ساتھ آسانی ہو یقیناً دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔

عُسر ایک اور یُسر دو سمجھے گئے ہیں سند میں شاعر کا یہ شعر پیش کیا ہے :۔

اذا اشتدت بك البلوى ففكر في الم نشرح　　　فعسر بين يسرين اذا فكرته فافرح

جب تجھ پر بلاؤں کی شدت ہو تو الم نشرح کی سورت میں غور کر کیونکہ ایک دشواری دو آسانیوں کے درمیان ہے یہ سوچکر خوش ہوجا۔

اصول فقہ کی رو سے اس کے معنی یہی ہوئے کہ بیٹے کی موجودگی میں خود اس کی اولاد محروم رہتی ہے یہ نہیں کہ کسی بیٹے کی موجودگی میں وہ حصہ نہ پائے، اس لئے یہ ہمارے مدعا کے مخالف نہیں ہے بلکہ مطابق ہے۔

علاوہ بریں یہ حدیث نبوی نہیں ہے، صرف حضرت زید بن ثابتؓ کا قول ہے اور تفسیر اور حدیث کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم وراثت کے مسائل میں اکثر رائے رکھتے تھے اور ان میں باہم ایک دوسرے سے اختلاف ہوجاتا تھا، چنانچہ کئی مسئلوں میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت زید بن ثابت میں اختلاف واقع ہوا ہے اور ایک نے دوسرے کی رائے کو تسلیم نہیں کیا۔ فتح الباری میں جد کے متعلق ایک قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسی کی وراثت کے بارے میں اپنے زمانے میں سو فیصلے کئے اور سب ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

شبہ پنجم : امام بخاریؒ نے یہی باب باندھا ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں بیٹے کی اولاد وراثت نہیں پاتی۔

جواب : بیشک، لیکن جو دلیل وہ اس کے اوپر لائے ہیں وہ ایک تو یہی حضرت زید بن ثابتؓ کا قول ہے جس کے متعلق تفصیل کے ساتھ ہم لکھ چکے ہیں، دوسری "اولیٰ رجل ذکر" والی حدیث ہے جس کے بارہ میں ہم نے ثابت کردیا ہے کہ وہ صرف کسی جزئی مسئلہ کا حکم ہے، قانون کلی نہیں ہوسکتی۔

شبہ ششم : جب بڑے بڑے علماء و فقہائے امت نے جن کی بزرگی اور علمی عظمت کو تم خود تسلیم کرتے ہو اپنی کتابوں میں تصریح کے ساتھ لکھدیا ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں یتیم اولاد محجوب ہوتی ہے تو پھر تم اس مسئلہ کو کیوں تسلیم نہیں کرتے۔ [1]

جواب : ان تصریحات سے میں بھی واقف ہوں لیکن فقہی مسائل میں ہم کو ہر ایک فقیہ سے خواہ وہ کتنا ہی معظم و محترم کیوں نہ ہو

---

[1] یہ بات میرے جواب میں مدرسہ دیوبند کے مفتی صاحب نے لکھی ہے۔

اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے، اورخاص کر اس مسئلہ میں جس کی عدم صحت کے قوی دلائل ہمارے پاس موجود ہوں، ایسے تنازع کی صورت میں قرآن مجید یہ حکم دیتا ہے۔

فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاٰخر

تم کسی بات میں آپس میں جھگڑ پڑو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو اگر اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔

اس لئے تاوقتیکہ کتاب اللہ کی کسی آیت سے اس مسئلہ کا ثبوت نہ دیا جائے، یا کوئی حدیث صحیح یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا کوئی فیصلہ پیش نہ کیا جائے اس وقت تک ہم کیونکر ایسا مسئلہ تسلیم کرلیں جو اسلامی شفقت بلکہ انسانی فطرت کے بھی خلاف معلوم ہوتا ہے، اور جس کے مان لینے سے دشمنانِ اسلام کو اسلام کے قانون پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے۔

علمائے امت نبی تو نہیں ہیں کہ معصوم ہوں چنانچہ خود ان میں باہم بیشمار اختلافات ہیں قطعی حجت صرف کلام اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہی ہے اور بس۔

قرآن اور حدیث دونوں متوفی بیٹے کی اولاد کو قطعاً محروم نہیں کرتے، فقرہ میں اقرب کا صحیح مفہوم متعین نہیں کیا گیا، جس کی وجہ سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ یتیم اولاد محجوب قرار پا گئی، حالانکہ خود فقہا کے یہاں اس کے خلاف مثالیں موجود ہیں، مثلاً بیٹی کے ساتھ پوتی کو بھی وہ حصہ دلاتے ہیں، نیز پوتی، پڑوتی، سکڑوتی سب کو ایک درجہ میں رکھ کر برابر ترکہ دیتے ہیں لیکن یتیم اولاد کے بارے میں آکر یک قلم محجوب حرمان کا فرمان صادر کردیتے ہیں۔

باکہ ایں نکتہ تواں گفت کہ آں شیریں لب　　　کشت مارا ودم عیسیٰ مریم با اوست

یتیم اولاد کو خاندانی حقوق سے خارج کردینا اور ان کو ہمیشہ کیلئے ان کے آباؤ اجداد کی جائداد اور ملکیت سے محروم کردینا ایک ایسا خلاف فطرت قانون ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر انصاف پسند عقلا اس کو جائز رکھتے ہیں، کوئی شخص ٹھنڈے دل سے سوچکر انصاف سے کہے کہ خدانخواستہ اگر وہ خود یا اس کی اولاد اس قانون کی رو سے محجوب ہو تو کیا وہ اس کو پسند کرے گا؟ لہٰذا ہرچہ بر خود نہ پسندی بردیگراں مپسند، قرآن میں ہے:۔

ولیخش الذین لو ترکوا من خلفھم ذریۃ ضعٰفا خافوا علیھم۔ فلیتقوا اللہ ولیقولوا قولاً سدیدا

اور ان لوگوں کو خوف کرنا چاہیے جو اگر اپنے بعد ناتوان اولاد چھوڑ جاتے تو ان پر ترس کھانے اسلئے ان کو چاہیئے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور ٹھیک بات کہیں۔

پوتوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت قرار دیا ہے، چنانچہ فرمایا ہے۔

واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجا وجعل لکم من ازواجکم بنین وحفدۃ ورزقکم من الطیبات افبالباطل یؤمنون وبنعمۃ اللہ ھم یکفرون ۔

اور اللہ نے تمہیں میں سے تمہاری بیویوں کو پیدا کیا اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور پاک چیزوں سے تم کو روزی عطا فرمائی۔ کیا پھر بھی لوگ جھوٹے معبودوں پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔

کیا نعمت الٰہی کی قدر و حرمت یہی ہے کہ وہ خاندان سے خارج اور اپنے باپ دادا کی کمائی اور محنت کے ثمرہ سے محروم کر دی جائے اور در بدر ٹھوکریں کھاتی پھرے۔

یتیم اولاد کے محجوب کرنے میں صرف یہی برائی نہیں ہے کہ وہ اسلامی شفقت اور انسانی فطرت کے خلاف ہے بلکہ معاشرت میں اس سے خرابیاں واقع ہو سکتی ہیں۔

ایک خرابی تو یہ ہے کہ محجوب اولاد کے دلوں میں محرومی کی وجہ سے رنجش پڑ جاتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص فرشتہ تو نہیں ہے کہ مادی جذبات سے بالاتر ہو، انسان کی فطرت اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ جب وہ دیکھتا ہے کہ میرے ہی بزرگوں کی کمائی سے جن کا خون میری رگوں میں گردش کر رہا ہے، میرے چچازاد بھائی تو عیش و عشرت کر رہے ہیں اور میں بلا کسی قصور کے اس سے بالکل محروم ہوں تو اس کو صبر نہیں آتا۔

سخن درست بگویم نمے توانم دید کہ مے خورند حریفان و من نظارہ کنم

اس رنجش کی بدولت خاندان میں ایک دائمی عداوت کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے دینی اور دنیاوی برکتیں مفقود ہو جاتی ہیں اور ترقی نہیں ہوتی بلکہ بعض حالتوں میں یہ عداوت خاندان پر تباہی اور بربادی لاتی ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ سب لائق بیٹوں کو جو باپ کے خدمت گزار ہیں اور اس کی ملکیت کے انتظام و ترقی میں دن رات محنت اور کوشش کرتے ہیں، یہ یقین ہو جائے گا کہ اگر اتفاقاً وہ اپنے باپ سے پہلے مر گئے تو ان کی اولاد محجوب ہو جائے گی۔ تو وہ باپ کی خدمت اور اس کے کاروبار سے پہلو تہی کرنے لگیں گے اور اپنی کمائی اور کوشش سے اپنی جداگانہ ملکیت پیدا کرنے کی فکر میں پڑ جائیں گے کہ اگر احیاناً ایسا حادثہ پیش آ جائے تو ان کی اولاد کے پاس کچھ سرمایہ رہے اور وہ بالکل ہی دست نگر اور محتاج نہ رہ جائے، اسلئے کہ یہ امر فطرتی ہے کہ انسان کو اپنے ماں باپ سے زیادہ اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے۔

تو ایسی حالت میں جبکہ بیٹے اس خیال میں پڑ جائیں گے نہ باپ کی جائیداد اور ملکیت کا انتظام درست ہوگا نہ اس میں ترقی ہو سکے گی۔ علاوہ بریں باپ کو اپنے بڑھاپے کے زمانے میں بھی جو توبہ اور عبادت کا وقت ہے اپنے دنیاوی کاروبار سے سبکدوشی حاصل نہ ہو سکے گی، اور اولاد سے وہ جائز آسائش اس کو نہ مل سکے گی جس کی عہد پیری میں ان سے توقع کی جاتی ہے اور نہ اولاد ہی اس کی خدمت کر کے سعادتمندی حاصل کرنے کے قابل ہو گی۔

تیسری خرابی ایک مثال سے سمجھ میں آ سکتی ہے، فرض کیجئے کہ ایک دولتمند کے دو بیٹے ہیں جن میں سے ایک بیٹے کے چار بیٹے، ایک کا صرف ایک ہی بیٹا ہے، اب اگر چار بیٹوں کا باپ خود اپنے باپ کی زندگی ہی میں مر جائے تو اس کے چاروں بیٹے محجوب الارث کے قانون کی رو سے سمجھ لیں گے کہ جو کچھ خاندانی ملکیت ہے وہ دادا کے مرنے پر چچا کو اور پھر اس سے منتقل ہو کر چچازاد بھائی کو ملے گی۔ ہم چاروں بھائی تو ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہو گئے۔ اس لئے ان میں سے اگر کوئی محرومی کے خیال سے غیظ و غضب میں آ کر اپنے بھائیوں کی خاطر بلا ان کے مشورہ کے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر دادا کی زندگی ہی میں چچا کو

کسی حیلہ سے مار ڈالے تو بالکل قرینِ قیاس ہے۔ کیونکہ آئے دن مال و دولت کے پیچھے دنیا میں خونریزیاں ہوتی رہتی ہیں، بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ بشرطِ ثبوت قاتل کو سزا مل جائے گی لیکن اس کے بقیہ تین بھائی جو پہلے بالکل محروم تھے، اب دادا کے ترکہ میں سے تین ثلث کے حصہ دار ہوں گے اور اپنے چچا زاد بھائی سے جو پہلے اپنے باپ کے ذریعہ سے سارے ترکہ کا وارث ہوتا تگنا حصہ پائیں گے اس غریب کا باپ بھی مارا گیا اور حصہ بھی صرف ایک چوتھائی رہ گیا۔ اور قاتل کے بھائی جو محجوب تھے اس سے تگنے کا حقدار ہوگئے۔[1]

اس لئے یہ محجوب الارث کا مسئلہ بعض صورتوں میں قتل اور قطع رحم کا بھی محرک ہو سکتا ہے۔

الغرض مسئلہ محجوب الارث میں ظاہری اور باطنی ہر قسم کی خرابی ہے اور یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ اسی وجہ سے اہل اسلام اس مسئلہ کو اگرچہ مانتے چلے آتے ہیں لیکن ان کی طبیعتیں اس سے مالوف نہیں ہیں اور عام طور پر ان کے دلوں میں یہ کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔

امید ہے کہ فقہائے اسلام ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر اس مسئلہ پر غور فرمائیں گے اور نہایت کمزور دلائل کی بنیاد پر یتیم اولاد کو خاندانی حقوق سے بلا قصور محروم کر کے اسلام کے مقدس دامن پر یتیموں کے خون کے دھبے نہ ڈالیں گے۔

ہم سے غلطی ہونی ممکن ہے لیکن اسلام دین الٰہی ہے وہ ہر قسم کی غلطیوں سے مبرا اور پاک ہے۔

گر من آلودہ دامنم چہ عجب   ہمہ عالم گواہِ عصمتِ اوست

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

---

[1] فقہا ایک درجہ کے ایک قسم کے ورثہ میں ترکہ کو علی الرؤس تقسیم کرتے ہیں، مثلاً زید اگر اپنے چار پوتے چھوڑ کر مر جائے جن میں سے تین ایک بیٹے کے ہوں اور ایک ایک بیٹے کا تو وہ چاروں برابر کے حصہ دار ہوں گے۔ یہ طرز تقسیم ایسا ہے کہ نہ اس پر قرآن شاہد ہے نہ حدیث، اور عقل کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ وہ تینوں بیٹے اپنے باپ کے قائم مقام ہیں جو زیادہ سے زیادہ نصف کا حصہ دار ہو سکتا تھا پھر اس کے قائم مقام تین ثلث کیونکر پا سکتے ہیں۔ یہاں بھی فقہا نے قائم مقامی کے اصول کو نظرانداز کر دیا۔

قانونِ حجب

(محترم تمنا عمادی صاحب)

[یتیم پوتے کی وراثت سے متعلق مختلف مضامین اشاعتِ سابقہ میں آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ محترم تمنا عمادی نے بھی زیرِ نظر مقالہ میں اپنے مخصوص انداز میں اسی نکتہ کی وضاحت فرمائی ہے کہ یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے کبھی محروم نہیں ہو سکتا۔ یہ بحث فنی ہے اور اس کے مخاطب وہ حضرات ہیں جو قانونِ فرائض کی فقہی بحثوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

ہمیں مقالہ کے بعض جزئی مقامات سے اختلاف ہے لیکن ان اختلافات کا موضوعِ زیرِ نظر پر کچھ اثر نہیں پڑتا اسلئے ہم نے ایک آدھ مقام کے علاوہ ان اختلافات کی وضاحت ضروری نہیں سمجھی۔ اگر "فنِ وراثت" کے متعلق کبھی تفصیلی بحث کی ضرورت پڑی تو ان مقامات کو بھی سامنے لایا جائے گا۔ طلوعِ اسلام]

قرآنِ مبین میں کہیں بھی وراثت سے محجوب ہونے والے وارثوں کی کوئی تصریح نہیں اور نہ اس کی ضرورت تھی، جبکہ خود فرما دیا کہ للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون (خلاصۂ ترجمہ) باپ ماں اور قریب ترقرابتمندوں نے مرنے کے بعد جو کچھ چھوڑا ہے اس مال متروکہ میں مرد قریب تر وارثوں کیلئے بھی ایک حصہ ہے اور عورت قریب تر وارثوں کیلئے بھی مما قلّ منه او کثُر وہ حصہ کم ہو یا زیادہ۔ یا وہ مال متروکہ کم ہو یا زیادہ (پہلی صورت میں من بیانیہ ہوگا دوسری صورت میں تبعیضیہ) اور فرمایا گیا و لکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم۔ ہم نے ہر ایک (مرنے والے) کے لئے ترکے کے حقدار ورثا بنا دیئے ہیں (وہ کون کون ہیں؟) باپ ماں ہیں، قریب تر قرابتمند ہیں اور وہ ہیں جنھیں تمہارے داہنے ہاتھوں نے گرہ میں باندھ رکھا ہے (یعنی عقدِ نکاح کے ذریعے) تو ان ورثا کو ان کا حصہ دیدو (ما ترک پر وقف لازم چاہئے اور اس کے بعد "الاقربون" پر وقف صحیح نہیں۔ بلکہ "ایمانکم" پر وقف ہونا چاہئے اور اس سے عہد کے روسے منہ بولے ورثا مراد لینا صحیح نہیں۔ بلکہ یہ آیت جاہلیت کے اسی رواج کو ختم کر رہی ہے کہ ہم نے تو تمہارے ورثا والدین، اقربون اور ازواج کو بنا دیا، بس انھیں کو ان کے حصے دیدو یعنی پھر اپنی طرف سے منہ بولے وارث بنانے کی کیا ضرورت ہے۔)

غرض والدین و ازواج کے علاوہ اقربون یعنی میت سے زیادہ نزدیک تر وارث جو بھی ہوں ترکہ پانے کے مستحق ہیں۔ اقرب کا لفظ یہ صاف بتا رہا ہے کہ جو زیادہ قریب ہوگا اس کے ہوتے دور کی قرابت والے وارث نہ ہوں گے اسلئے ہر قریب، بعید کا حاجب ہوگا۔ والدین اور ازواج مستقل ورثا ہیں۔ ازواج میں قرب و بعد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مگر والدین میں قرب و بعد کا سوال اسی وقت پیدا ہو جائیگا جب والدین کے والدین بھی ہوں۔ میت کے والدین نہ ہوں مگر اس کے والدین کے والدین ہوں تو وہی اقربین ہوں گے۔ مگر میت کے والدین

بھی ہوں اور والدین کے والدین بھی ہوں تو پھر میت سے قریب تر خاص میت کے والدین ہیں اور اس کے والدین کے والدین بعید ٹھہرے۔

اس اصول نے سمجھا دیا کہ "وارث قریب و بعید کے اعتبار میں شرکت فی النسب کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بعید کا خود کوئی حصہ نہ ہو وہ وہی حصہ پائے جو اس سے قریب تر پاتا" اور اس بعید کی قرابت اسی قریب کی وساطت سے میت تک پہنچی ہو۔ فقہاء نے اس کو شرط حجب قرار دے کر اس کا نام اِدْلاء رکھا ہے۔ "ادلاء" کے معنی از روئے لغت خود فقہاء "انمار، انتساب اور توسل" لکھتے ہیں۔ ادلاء کی تعریف طحطاوی سے صاحب ردالمحتار نے اور ان سے محشی شریفیہ نے حاشیہ سہ صفحہ ۵۸ میں یوں لکھی ہے: "اَلْاِدْلَاءُ لغۃ ارسال الدلو فی البئر ثم استعمل فی کل شیٔ یمکن فیہ دلو بطریق المجاز (لغت میں دلی یدلو دَلْوًا لکھ کر دلو کے معنی استقاء، توسل اور طلب لکھے ہیں) فمعنی یدلی الی المیت یوسل قرابتہ الیہ شخص۔ والباء فیہ للالصاق۔ فالقرابۃ مشترکۃ بین المدلی والواسطۃ۔

اس عبارت سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ اصطلاحی "ادلاء" جو یہاں حجب کیلئے شرط ہے اس کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ جو قرابت مدلی بہ یعنی واسطہ کو ہو وہی قرابت میت کے ساتھ مدلی کو بھی ہو۔ جیسے باپ اور دادا کہ "ابوۃ" میں دونوں شریک ہیں۔ مگر دادا کی اُبُوَّۃ میت تک باپ کے واسطہ سے پہنچتی ہے۔ اور بیٹا اور پوتا کہ بُنُوَّۃ میں دونوں شریک ہیں مگر پوتے کی بنوۃ بیٹے کے واسطے سے میت تک پہنچتی ہے۔ جس طرح میت اور میت کے دادا کے درمیان میت کا باپ واسطہ ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح میت اور میت کے پوتے کے درمیان میت کا بیٹا واسطہ ہوتا ہے تو دادا اور پوتے کو مدلی کہیں گے اور باپ اور بیٹے کو مُدْلیٰ بہ۔ فرق اس قدر دادا اور پوتے اور باپ اور بیٹے میں ضرور ہے کہ کئی باپ اور کئی دادا نہیں ہو سکتے مگر کئی بیٹے اور کئی پوتے ہو سکتے ہیں۔ قرآن مبین سے ادلاء کا اصول باپ ہی کی وراثت سے مستنبط ہوا ہے، اگر باپ کے نہ ہونے پر باپ کا حصہ دادا نہ پاتا اور اَبٌ میں دادا بھی شمار نہ کیا جاتا تو پھر بیٹے کے نہ ہونے پر پوتے کی وراثت محض قیاسی ہی رہتی، قرآن سے مستنبط نہ ہوتی۔ اور یہ سمجھا گیا کہ جس طرح اَبٌ میں دادا بھی داخل ہے اگر اب نہ ہو تو ابوالاب یعنی دادا ہی اَبٌ کی جگہ لے لیگا۔ اسی طرح ولد میں ولد الولد بھی داخل ہے۔ ولد نہ ہو تو ولد الولد اس کی جگہ لے لیں گے۔ فقہاء نے یہیں یہ دھوکا کھایا اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ ولد کے ہوتے ولد الولد بعید ہو گیا اس لئے کسی بیٹے کے ہوتے کسی پوتے کو بھی ترکہ نہیں ملنا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ ہاں نہیں ملنا چاہئے۔ مگر اُسی پوتے کو دادا کا ترکہ نہیں ملنا چاہئے جس پوتے کا باپ زندہ ہے، اسلئے کہ دادا اور پوتے کا درمیانی واسطہ موجود ہے۔ واسطہ یعنی مدلیٰ بہ کے ہوتے مدلی یقیناً بعید ہو گیا قریب نہ رہا۔ جیسے باپ کے ہوتے دادا بعید ہوتا ہے۔ مگر جس پوتے اور دادا کے درمیانی واسطہ یعنی مدلیٰ بہ موجود نہ ہو، وہ پوتا کیوں بعید ہونے لگا جس طرح میت اور اس کے دادا کے درمیان جو واسطہ ہو سکتا تھا وہ میت کا باپ تھا۔ میت کے باپ کے نہ ہونے کی صورت میں میت کا دادا میت کے چچا کی وجہ سے محجوب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میت اور میت کے دادا کے درمیان میت کا چچا کوئی حیثیت توسط نہیں رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح میت اور میت کے پوتے کے درمیان واسطہ میت کا وہی بیٹا تھا جو اُس کے اس پوتے کا باپ تھا۔ جب اس پوتے کا باپ نہ رہا تو میت اور اُس کے اس پوتے کے درمیان اس پوتے کا چچا بھی اسی طرح کوئی حیثیت توسط نہیں رکھتا۔ تو جب میت کا چچا میت کے دادا کو محجوب نہیں کر سکتا تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس پوتے کے چچا اس پوتے کو اپنے

---

[1] قرآن مجید سے مستنبط اصول حجب۔

میت دادا کے ترکہ سے محروم کردیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ مورث کا چچا وارث کو محجوب نہیں کرسکتا۔ مگر وارث کا چچا وارث کو محجوب کرسکتا ہے۔ وارث کے چچا کا قیاس مورث کے چچا پر صحیح نہیں۔ ایسا نہیں کہا جاسکتا کیونکہ چچا اور بھتیجے میں کوئی تعلق بلاواسطہ نہیں ہوتا اور بالواسطہ تعلق والا جو اپنے تعلق میں خود ایک واسطے کا محتاج ہے اتنی قوت نہیں رکھتا کہ جس سے بالواسطہ تعلق حاصل کرتا ہو، اس کا حاجب ہوجائے۔ اور پھر اس طرح کی باتیں ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب وارث کا بیٹا وارث کو محجوب نہیں کرسکتا تو مورث کا بیٹا وارث کو کیوں محجوب کرنے لگا؟ مگر اس طرح کے منطقی مغالطہ آمیز دلائل کی یہاں گنجائش ہی نہیں کیونکہ یہ مسئلہ محض قیاس پر مبنی رہا ہی نہیں۔ اس کی بنیاد جب ایک ایسے اصول پر خود فقہاء رکھ چکے ہیں جو قرآن مبین سے مستنبط ہے اور وہ میزان کا متفق علیہ اصول ہے۔

فتعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم! آپ شرائطِ حجب میں پہلی شرط ادلاء بیان کرچکے۔ اور مدلی اور مدلی بہ میں شرکت فی القرابت ضرور قرار دے چکے ہیں۔ بل الی المیت کے معنی خود لکھ چکے ہیں کہ یوسل قرابتہ الیہ بہ مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی نے اس کو اور بھی واضح فرما دیا اور شریفیہ کے صنہ و منہ میں حاشیہ ملہ میں صحیح تحریر فرمایا کہ واما الادلاء فانما یکون سببا للحجب لاجل المشارکۃ بین المدلی والمدلی بہ فی النصیب بان یکون المدلی شریکا فی نصیب المدلی بہ یعنی مدلی اور مدلی بہ میں جب تک اشتراک فی النصیب بھی نہ ہو صرف اشتراک فی القرابۃ کی وجہ سے ادلاء سبب حجب نہیں ہوسکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ فقہاء اور مولانا عبدالحی رحمہم اللہ یہ لوگ اپنے مفہوم کو پوری طرح ادا نہ کرسکے۔ اشتراک فی القرابۃ تو صحیح ہے مگر اشتراک فی النصیب کہنا صحیح نہیں بلکہ کہنا چاہئے استحقاق النصیب بالنیابۃ یعنی مدلی حصے کا مستحق ٹھہرے مدلی کی نیابت میں۔ اور ظاہر ہے کہ نیابت جبھی ہوگی کہ منیب موجود نہ ہو۔ منیب کے ہوتے نائب مستحق نہیں ہوسکتا۔ منیب نہ ہوگا تو نائب بےشک مستحق ہوجائے گا۔ چنانچہ مولانا عبدالحیؒ نے اس مفہوم کو خود ادا فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مدلی کا بذاتِ خود کوئی حصہ نہیں بلکہ مدلی بہ ہی کے حصے کو وہ مدلی بہ کے نہ ہونے کی وجہ سے پاتا ہے تو استحقاق بالنیابۃ ہوا نہ کہ اشتراک فی النصیب۔ اشتراک فی النصیب کیلئے ضروری ہے کہ دونوں شریک بیک وقت موجود ہوں ورنہ مورث و وارث دونوں کو شریک فی المال کہنا صحیح ہونا چاہئے۔ اب آپ دیکھئے پدرِ میت کے ہوتے جدِ میت کا کوئی حصہ نہیں مگر پدرِ میت نہ ہو تو جدِ میت پدرِ میت کا نائب و قائم مقام ہوکر پدرِ میت کا حصہ لے لیتا ہے۔ اسی طرح پسرِ میت کے ہوتے حفید یعنی نبیرۂ میت (میت کا پوتا) کسی حصے کا بھی مستحق نہیں۔ مگر پسرِ میت نہ ہو تو نبیرۂ میت اپنے باپ کا نائب و قائم مقام ہوکر اس کا حصہ لے گا۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس دادا پوتے کے درمیان اس پوتے کے چچا آجائیں اور اس کو وہ محجوب کردے۔ یہ پوتا مدلی ضرور ہے مگر اس کا مدلی بہ اس کا باپ تھا جو مرگیا۔ اس کا چچا اس کا مدلی بہ جب نہیں ہے تو پھر غیر مدلی بہ چچا اس کا حاجب کس طرح ہوسکتا ہے؟ فقہاء خود اس اشتراک کے لفظ کو لکھ کر پھر کچھ گھبرائے اس لئے اشتراک قرابت و اشتراک نصیب کی جگہ پھر صرف "اتحادِ سببِ ارث" لکھنے لگے۔

مگر جب ہمارے فقہاء نے دیکھا کہ یہ تو ایسا خراب اصولِ حجب بنا کہ اب نہ یتیم پوتے کو اس کے چچا کی وجہ سے دادا کے محجوب و محروم کیا جاسکے گا، نہ بھائی بہن کو باپ کی وجہ سے محروم بھائی کے ترکہ سے محروم کیا جاسکتا ہے۔ تو فقہاء خود اپنے بنائے ہوئے قرآن مبین سے مستنبط اصول کو توڑ ڈالا اور تحریر فرماتے ہیں کہ ثم نقول ههنا معنیان اتحاد السبب والادلاء۔ ولکل منهما تاثیر فی الحجب۔ فکما ان

اتحادالسبب اذاانفرد عن الادلاء تعلق بہ حکم الحجب، کذلک اذاانفرد الادلاء عنہ ثبت بہ الحجب ایضاً. یعنی پھر ہم کہتے ہیں کہ یہاں دو معنی ہیں۔ ایک تو اتحادِ سببِ ارث، دوسرے ادلاء۔ اور ان میں سے ہر ایک کا کسی وارث کو محجوب کرنے میں ایک مستقل اثر ہے تو جس طرح اتحادِ سببِ ارث اگر ادلاء سے خالی ہو، جب بھی اس کی وجہ سے حجب کا حکم کسی وارث کے متعلق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ادلاء اگر اتحادِ سببِ ارث سے خالی ہو تو اس سے بھی حجب ثابت ہو سکتا ہے (شریفیہ ص۱۲۱) مگر یہ دونوں معنی کہاں سے پیدا ہوئے؟ ان کا کون سا ماخذ ہے؟ کہاں سے استنباط کیا؟ کچھ نہ لکھا، اور نہ کوئی بتا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اشتراک فی القرابۃ اور استحقاق نصیب بالنیابۃ اصل سبب حجب ہے اور ادلاء اس کی لازمی شرط ہے۔ بغیر ادلاء کے صرف اشتراک فی القرابۃ حاصل ہے اور اتحاد نصیب بھی مگر ادلاء اور استحقاق بالنیابۃ نہیں ہے اسلئے ایک بیٹا دوسرے بیٹے کا اور ایک بیٹی دوسری بیٹی کی حاجب نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح صرف ادلاء بھی سبب حجب نہیں ہو سکتا ورنہ احد الزوجین کو اولاد کا حاجب ہونا چاہئے کیونکہ احد الزوجین (شوہر یا بیوی) اولاد کے لئے مدلی بہ اور واسطۂ قرابت ہیں۔ چنانچہ امام الفرائض سید شریف جرجانی شریفیہ میں تحریر فرماتے ہیں: فان المدلی بہ حینئذ یاخذ نصیبہ المستند الی سببہ والمدلی یاخذ نصیبا اٰخر مستند الی سبب اٰخر۔ فلا حرمان. کما فی الام واولادہ۔ یعنی ایسی صورت میں مدلی بہ اپنا ذاتی حصہ پاتا ہے جو اس کے اپنے خاص سبب ارث کی وجہ سے ملتا ہے، اور مدلی اپنا حصہ ایک دوسرا پاتا ہے جو پہلے حصے کا مغائر ہے۔ اسی لئے ایک کی وجہ سے دوسرے کو وراثت سے محرومی نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ ماں اور اس کی اولاد کے درمیان باوجود ادلاء کے اولاد محروم عن الارث نہیں ہوتی۔ تو پھر کوئی بتلائے کہ یہی صورت تو باپ اور باپ کی اولاد کے درمیان بھی ہے۔ پھر باپ کی وجہ سے باپ کی اولاد کیوں محروم قرار دی جاتی ہے؟ بَيِّنُوا تُؤْجَرُوا!

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

کمال تو یہ ہے کہ شریفیہ کے اسی صفحہ ۱۲۱ پر جس میں صاحب شریفیہ نے دو عجیب و غریب معنی لکھے ہیں باوجود امام الفرائض ہونے کے کہ اتحاد سبب بغیر ادلاء کے اور ادلاء بغیر اتحاد سبب کے بھی موجب حجب ہو سکتا ہے مولانا عبدالحی حاشیہ ۱۲ صفحہ ۴۱ و ۴۲ میں لکھتے ہیں کہ ومحصول الحاصل ان الادلاء انما یوجب الحجب اذا کان المدلی بہ عصبۃ مستحقا لجمیع المال او اتحد فی سبب الارث کما ان ام الام تسقط لوجود الام۔ وابوالاب یسقط لوجود الاب۔ لان سبب الارث ھو الامومۃ والابوۃ۔ فثبت ان الادلاء مطلقا لیس سببا للحجب بالحرمان بل الادلاء الخاص سبب لہ۔ یعنی خلاصہ کلام یہ ہے کہ ادلاء سبب حجب جبھی ہوگا کہ مدلی بہ عصبہ مستحق جمیع مال کا ہو، یا مدلی بہ اور مدلی دونوں سبب ارث میں متحد ہوں جیسا کہ نانی ماں کے ہوتے محروم ہو جاتی ہے اور دادا باپ کے ہوتے محروم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سبب ارث وہی ماں ہونا اور باپ ہونا ہے۔ (یعنی ماں ہونا، ماں اور نانی میں مشترک ہے۔ اور باپ ہونا، باپ اور دادا میں مشترک ہے) تو ثابت ہوا کہ مطلق ادلاء حجب حرمان کا سبب نہیں ہے بلکہ خاص ادلاء اس کا سبب ہے۔

اس حاشیہ میں اس کا پتہ ملا کہ باپ کو بھائی بہن کا حاجب قرار دینے کیلئے ایک قید اور بڑھائی گئی یعنی مدلی بہ کا عصبہ مستحق جمیع مال ہونا یعنی جب جیسی ضرورت پیش آئی ایک قید بڑھادی گئی۔ چاہے کسی نص قطعی پر مبنی ہو یا نہ ہو۔ حالانکہ ہر عصبہ مستحق جمیع مال ہوجاتا ہے اگر کوئی دوسرا وارث نہ ہو۔ ورنہ دوسرے ورثاء سے جو باقی بچے گا وہی وہ پائے گا۔ عصبہ کسی وارث کا بھی حاجب نہیں ہوسکتا اور یہ وہ باتیں ہیں جن سے کوئی فرائض جاننے والا انکار نہیں کرسکتا۔ اور اگر صرف مستحق جمیع مال ہوجانے کی وجہ سے صرف ادلاء بغیر اتحاد سبب ارث کے موجب حجب ہوسکتا ہے تو ماں بھی بعض وقت مستحق مال ہوجاتی ہے

ہمارے فقہاء نے پہلے اس کو سوچ لیا کہ کس کس کو کس کس کا حاجب بنانا ہے۔ اس کے بعد اس کے لئے اصول بنانے بیٹھے تو ایک اصول بنایا، کسی جگہ وہ کام دیتا نظر نہ آیا تو ایک قید بڑھادی۔ تیسری جگہ پھر دشواری بڑی تو پھر ایک اور قید کا اضافہ کیا کہیں علیٰ سبیل الاجتماع، کہیں علیٰ سبیل البدلیت۔ یعنی کہیں چند شرطوں میں سے ہر ایک کا پایا جانا ضروری قرار دیا گیا کہیں یہ کہ یا یہ ہو یا وہ۔
(باپ کو بھائی بہن کے حاجب بنانے کی کوشش صرف کلالہ کے صحیح معنی نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے فقہاء کرتے رہے، جس کی بنیاد ابوجعفر بن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں رکھی اور پھر سارے فقہاء ومفسرین اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ میں اس کی بحث آگے کرونگا ابھی شرائط حجب کی بحث جو باقی رہ گئی ہے اس کو ختم کرلینا ضروری ہے۔)

مگر حقیقت یہ ہے کہ باپ ہو یا ماں، لغت کے اعتبار سے یہ مدلی بہ اور بھائی بہن مدلی ضرور ہوجاتے ہیں اسلئے کہ بھائی بہن سے میت کو قرابت والدین ہی کے واسطے سے ہوتی ہے۔ مگر یہ اصطلاحی ادلاء نہیں ہے جو سبب حجب ہوسکے۔ میں امام طحطاوی کی تحریر ردالمحتار کی تصدیق، اور محشی شریفیہ کی توثیق سے یہ ثابت کرچکا ہوں کہ جو ادلاء سبب حجب ہے اس کیلئے مدلی بہ اور مدلی کے درمیان اشتراک فی القرابۃ ضروری ہے اور باپ ماں اور بھائی بہن کے درمیان اشتراک فی القرابۃ نہیں ہے۔ دونوں کی قرابتیں دو طرح کی ہیں۔ پھر اشتراک فی القرابۃ کو بدل کر یا اس کے ساتھ اشتراک فی النصیب کا لفظ رکھا گیا۔ پھر بھی بعض جگہ حجب کی گاڑی چلنے سے رہ گئی۔ تو پھر حجب کیلئے ایک دوسری اصل ٹھہرائی گئی۔

اصل دوم | اصول حجب میں پہلی اصل ادلاء کا حال تو آپ ملاحظہ فرماچکے۔ دوسری اصل الاقرب فالاقرب کی ہے۔ یہ بھی قرآن مبین ہی کے لفظ الاقربون سے مستنبط ہے۔ یعنی قریب تر کے ہوتے صرف قریب، ترکہ نہیں پاسکتا، اسلئے ہر قریب اپنے سے بعید کا حاجب ہوگا۔ فقہاء عام عصبات میں تو اس اصول کو مطلقاً مانتے ہیں۔ مگر ذوی الفروض میں اور ذوی الارحام میں بھی اس اصل کو مشروط باتحاد سبب ارث قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ شریفیہ میں قد مرفی باب العصبات انھم یرجحون بقرب الدرجۃ فالاقرب منھم یحجب الابعد حجب حرمان سواء اتحدا فی السبب ادلاء۔ ھذا جار فی غیرھم ایضا۔ لکن اذا کان ھناک اتحاد السبب۔ یعنی عصبہ کے بیان میں یہ لکھا جاچکا ہے کہ ان میں قرب درجہ کی وجہ سے ترجیح دی جاتی ہے تو جو قریب تر ہوتا ہے وہ بعید کو محجوب کردیتا ہے بالکل محروم قرار دے کر چاہے وہ قریب و بعید سببِ ارث میں متحد ہوں یا نہ ہوں۔ اور یہ اصول غیر عصبہ میں بھی جاری ہے۔ لیکن غیر عصبہ میں اتحاد سببِ ارث بھی ہو جب۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ عصبات میں بھی اتحاد سبب ارث ہی کی وجہ سے ایک عصبہ دوسرے کو محجوب و محروم کرتا ہے۔ کیونکہ عصبات میں سبب ارث صرف عصوبۃ ہے یعنی عصبہ ہونا۔ اور اس میں قریب و بعید یعنی حاجب و محجوب دونوں شریک ہوتے ہیں۔ عصبہ کا کوئی حصہ معین ہوتا ہی نہیں کہ اتحاد یا اشتراک فی النصیب کا سوال یہاں پیدا ہو۔ باقی رہا اشتراک فی القرابۃ تو ادلاء کے ساتھ بھی الاقرب فالاقرب کا اصول موجب حجب ہوگا۔ جیسے باپ کے ہوتے دادا اور چچا کے ہوتے چچیرے بھائی محروم و محجوب ہوں گے۔ اگر ادلاء نہ ہو تو صرف قرب و بعد اشتراک قرابت عمومی و اشتراک عصوبت کی وجہ سے موجب حجب ہوگا۔ جیسے باپ کے ہوتے چچا یا چچیرے بھائی محجوب ہوتے ہیں۔

ایک عجیب بات

قرآن مبین سے جو الاقرب فالاقرب کا اصول مستنبط ہوتا ہے تو قریب تر رشتہ دار کو ان کے مورث کے مال میں سے حصہ دلوانے کیلئے۔ مگر ہمارے فقہا نے الاقرب فالاقرب کا اصول قائم کیا ہے وارث بعید کو محجوب و محروم کرنے کے لئے۔ بات تو بظاہر دونوں ایک ہی معلوم ہوتی ہے مگر نیت کے فرق کی وجہ سے طریق غور و تدبر اور اس کے نتائج میں تفاوت پیدا ہو کر رہا۔ الاقرب فالاقرب کے معنی تو یہ ہیں کہ الاقرب یستحق ثم الاقرب نہ کہ الاقرب یحجب ثم الاقرب اور یہ ترکیب الٹی گئی ہے فحوائے قرآن مبین کے خلاف صرف یتیم پوتے کو اس کے دادا کے ترکہ سے چچا کی وجہ سے محجوب و محروم کرنے کیلئے۔ چنانچہ خود سید شریف جرجانی شارح سراجیہ تحریر فرماتے ہیں۔ وانما لم یکتف المصنف بالاصل الاول لئلا یتوھم ان ولد الابن ذکرا کان او انثی یرث مع الابن الذی لیس بابیہ فانہ لا یدلی بہ یعنی صاحب سراجیہ نے اصل اول پر اکتفا نہ کی تاکہ اس کا گمان نہ ہو کہ پوتا یا پوتی اپنے چچا کے ہوتے دادا کے وارث ہو سکتے ہیں، کیونکہ چچا ان کا مدلی بہ نہیں ہے۔ اس پر مولانا عبدالحی لکھنوی حاشیہ میں لکھتے ہیں؛ و وجہ الوہم لان الاصل الاول للحجب منتف ھھنا لان ولد الابن (المتوفی) لیس بمدلی بھذا الابن (الحی) فلما ذکر الاصل الثانی ایضا اندفع (ای ذلک الوھم) لان فی الصورۃ المذکورۃ وان لم یوجد الاصل الاول لکن الاصل الثانی موجود البتہ۔ فیحجب ابن الابن (المتوفی) بالابن الاخر (الحی) لقربہ منہ۔ یعنی جس وہم سے سید شریف جرجانی اور ان سے پہلے صاحب سراجیہ ڈرے تھے وہ وہم اس طرح پیدا ہوتا تھا کہ حجب کی پہلی اصل یعنی ادلاء پوتے اور اس کے چچا کے درمیان نہیں ہے کیونکہ اس پوتے کی قرابت میت کے ساتھ اپنے متوفی باپ کے واسطے سے قائم ہے نہ کہ اپنے چچا کے واسطہ سے۔ اس لئے چچا مدلی بہ نہ ہوا اور جب مدلی بہ نہ ہوا تو وہ حاجب بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ حاجب وہی ہو سکتا ہے جو مدلی بہ ہو، اور اس مدلی بہ کے ہوتے وہی محجوب ہوگا جو اس مدلی بہ کا مدلی ہو۔ اسلئے چچا اپنے یتیم بھتیجے کو اس کے دادا کے ترکے سے محروم نہیں کر سکتا۔ مگر جب دوسری اصل بھی قائم کر لی گئی الاقرب فالاقرب والی تو اس کے رو سے چچا اپنے یتیم بھتیجے کو اس کے دادا کے ترکہ سے محروم کر دے گا کیونکہ میت سے قریب تر بیٹا ہے، اور بیٹے کے مقابل پوتا بعید ہے اور اس دوسری اصل میں ادلاء کی قید نہیں لگی ہوئی ہے صرف اتحاد سبب ارث کی شرط لگی ہے۔ اور اتحاد سبب ارث یعنی بنوۃ (ابن ہونا) بیٹے اور پوتے دونوں میں موجود ہے۔ پوتا بھی چونکہ ابن الابن ہے اس لئے ابن ہی ہے۔ مولانا عبدالحی کے حاشیے کا یہی مطلب ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ قرآن مجید سے جو الاقرب

یستحق الارث فالاقرب کا اصول مستنبط ہوتا ہے اس کو الٹ کر الاقرب یحجب الابعد فالاقرب بنایا گیا صرف یتیم پوتوں کو دادا کے ترکے سے محجوب کرنے کے لئے۔

گمراہ کن اصول

یہ کتنا گمراہ کن اصول ہے کہ پہلے چند مسائل اپنے ذہن میں طے کرلیں کہ ان کے یہ جوابات ہونے چاہئیں اور ان کے جوابوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ناپ ناپ کر اصول بنائے جائیں اور اس کے بعد کہدیا جائے کہ ان اصول کے ماتحت یہ جوابات ان مسائل کے ہیں اور وہ اصول بھی تمام قیود کے ساتھ پہلے نہ بنائے جائیں۔ بلکہ جب ایک نئی ضرورت پیش آئے ایک قید بڑھادی جائے۔

ایک ہی اصل پر اکتفا کیوں نہ کی؟

سراج الملۃ والدین محمد بن عبدالرشید السجاوندی نے سراجیہ میں مسئلہ حجب کی بنیاد دو اصلوں پر رکھی ہے۔ ادلاء اور الاقرب فالاقرب۔ صرف اصل اول پر اکتفاء کیوں نہ کی؟ اس کی وجہ سراجیہ کے شارح شریفیہ والے علامہ سید شریف جرجانی کی زبانی ابھی آپ سن چکے کہ اصل دوم صرف اسلئے قائم کی گئی کہ یتیم پوتے اپنے دادا کے ترکہ سے چچا کی وجہ سے محجوب کردیئے جاسکیں۔ بس اسی ایک ضرورت نے اصل دوم قائم کرنے پر مجبور کیا۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ توپھر اصل دوم ہی پر اکتفاء کیوں نہ کی تو اس کی وجہ بھی خود تحریر فرماتے ہیں: لئلا یتوھم ان ام الام لا ترث مع الاب ھکذا قیل۔ وفیہ نظر۔ لان الاصل الثانی ان اجری ھھنا علی ظاھرہ وھوان الاقرب فی الدرجۃ مطلقاً یحجب الابعد لزم منہ حجب ام الام بالاب وحجب ابن الاخ لاب وام بالاخ لام۔ وان قید بان یکون الابعد مدلیا بالاقرب کان الاصل الثانی بعینہ الاصل الاول فلا معنیٰ لجعلھما اصلین۔ وکان الوھم لازماً وھوان اولاد الابن (المتوفی) یرثون مع الابن (الحی) لیس اباھم۔ یعنی اصل دوم پر اسلئے اکتفاء نہ کی کہ کہیں یہ وہم نہ پیدا ہوجائے کہ باپ کے ہوتے نانی محجوب ومحروم ہے۔ اسی طرح بات بنائی گئی ہے مگر یہ محل نظر ہے کیونکہ اصل ثانی اگر اپنے ظاہری مفہوم پر جاری کی گئی کہ جو درجہ وراثت میں مطلقاً قریب ہو وہ بعید کو محجوب ومحروم کردیگا۔ تو اس سے لازم آئیگا کہ نانی کو باپ محجوب کردے اور عینی بھائی کے بیٹے کو اخیافی بھائی محجوب کردے اور ایسا ہے نہیں۔

اور اگر اس اصل دوم میں بھی ادلاء کی قید لگا کر کہا جائے کہ بعید مدلی ہو اور قریب مدلی بہ جب قریب بعید کو محجوب کردے گا تو پھر اصل ثانی بعینہٖ اصل اول ہوجاتی ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں رہتا، اسلئے پھر دو اصلیں قائم کرنا بے سود ہوجاتا ہے۔ اور سب سے بڑی دشواری یہ پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ پہلا وہم جس کو دور کرنے کے لئے یہ اصل دوم بنائی گئی تھی پھر خطرہ بن کر سامنے آجاتا ہے یعنی جب تو یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے اس کے محجوب ومحروم نہ کرسکیں گے۔ کیونکہ چچا اپنے یتیم بھتیجوں کے مدلی بہ نہیں ہیں۔ اور یہ برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

صاحب شریفیہ نے جو فیہ نظر لکھا ہے اس پر مولانا عبدالحی مرحوم حاشیہ ۵ صفحہ ۵۹ میں تحریر فرماتے ہیں۔ وحاصل الا مراد المصدر بقولہ فیہ نظر ان الاصل ان اجری علی ما یستفاد ظاھرا وھوان الابعد یکون محجوبا بالاقرب سواء

كان مدليا بالاقرب اولا فيلزم حجب ام الام بالاب لانها ابعد منه البتة وان لم تكن مدلية بها۔ وحجب ابن الاخ العينى بالاخ الاخيافى. لان الاول ابعد من الثانى وان لم يكن مدليا به۔ وان اريد ان الابعد المدلى يحجب بالاقرب المدلى به يكون هذا الاصل عين الاصل الاول معنى۔ وتتمة الايراد انه ان اريد ان الابعد الغير المدلى يحجب بالاقرب الغير المدلى به يلزم منه ما يلزم على الاول۔ وان اريد ما سواه فيجب ان يبين۔ یعنی سید شریف نے شریفیہ میں "فیہ نظر" لکھکر جو اعتراض کیا ہے اس اعتراض کا ماحصل یہ ہے کہ یہ اصل دوم اگر اپنے ظاہری معنی میں لیا گیا کہ بعید قریب کی وجہ سے محجوب ہوجائے گا چاہے بعید مدلی اور قریب مدلی بہ ہو یا نہ ہو، تو اس سے یہ لازم آجائے گا کہ نانی باپ کی وجہ سے محروم ہوجائے کیونکہ باپ کے مقابل ماں کی ماں ضرور بعید ہے۔ اگرچہ نانی مدلی اور باپ مدلی بہ نہیں ہے۔ اسی طرح عینی بھائی کا لڑکا اخیافی بھائی کے مقابل محجوب ہوجائیگا کیونکہ بھائی کے مقابل بھتیجا ضرور بعید ہے اگرچہ یہ بھتیجا جو عینی بھائی کا بیٹا ہے، اخیافی بھائی کا مدلی، اور اخیافی بھائی اس کا مدلی بہ نہیں ہے۔

اور اگر الاقرب فالاقرب سے یہ مراد ہے کہ بعید مدلی محجوب ہوجاتا ہے قریب مدلی بہ کی وجہ سے؟ تو یہ اصل دوم بالکل وہی اصل اول معنوی اعتبار سے ہوجاتی ہے۔ اور اس اعتراض کا تتمہ یہ ہے کہ اگر الاقرب فالاقرب سے یہ مراد ہے کہ بعید غیر مدلی، قریب غیر مدلی بہ کی وجہ سے محجوب ہوتا ہے، تو اس سے وہی بات لازم آجاتی ہے جو پہلی اصل سے لازم آتی ہے اور اگر اس کے سوا کچھ اور معنی الاقرب فالاقرب کے ہیں تو اس کا بیان کرنا واجب ہے۔

مولانا عبدالحی صاحب رحمہ اللہ کا خلاصہ مطلب یہ ہے اور یہی مطلب صاحب شریفیہ کا بھی ہے کہ اگر اصل دوم الاقرب فالاقرب میں ادلاء کی قید بھی ضروری ہے تو پھر یہ اصل بیکار ہے صرف پہلی ہی اصل کافی ہے۔ اور اگر بغیر ادلاء کے صرف درجہ رشتہ مندی میں قرب و بُعد مقصود ہے تو پھر دوسری دشواریاں پیدا ہوجاتی ہیں یعنی باپ کی وجہ سے نانی اور اخیافی بھائی کی وجہ سے عینی بھائی کا لڑکا بھی محجوب ہوجاتا ہے اور ہم فقہاء صرف یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے چچا کی وجہ سے محروم کرنا چاہتے ہیں، اور ایسی کوئی صورت نکلتی نہیں جس سے صرف یہی یتیم پوتے محروم ہوں اور دوسرے جائز وارث محروم نہ ہوں، کیونکہ صورت دو ہی ہیں۔ اقرب و ابعد کے درمیان ادلاء ہو یا نہ ہو، اگر ہو تو یہ پہلی اصل ہوجاتی ہے اور چونکہ یتیم بھتیجے اور چچا کے درمیان ادلاء نہیں ہے اس لئے یتیم بھتیجا اپنے چچا کی وجہ سے محجوب نہیں ہوسکتا۔ اور اگر بغیر ادلاء کے ہر قریب اپنے سے بعید کو محجوب و محروم کردے، یہ معنی لئے جائیں تو یتیم بھتیجا اپنے چچا کی وجہ سے محجوب تو ہوجاتا ہے مگر دشواری یہ آپڑتی ہے کہ پھر باپ کی وجہ سے نانی بھی محجوب ہوجاتی ہے اور اخیافی بھائی کی وجہ سے عینی بھائی کا لڑکا بھی محجوب ہوجاتا ہے! درحقیقت یہ ایسی دھڑی ہے جو اٹھائی نہیں جاتی۔ اور اگر کوئی تیسری شکل ایسی ہے جس سے صرف یتیم پوتا ہی اپنے دادا کے ترکہ سے چچا کی وجہ سے محجوب کردیا جاسکے تو مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ فیجب ان یبین یعنی واجب ہے کہ وہ صورت بیان کی جائے۔ مگر یہ نہیں لکھا کہ کس پر واجب ہے؟ اور اس واجب کو کون ادا کرے گا؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ قیامت تک یہ واجب الادا قرض ہمارے فقہاء غفر اللہ لہم پر یوں ہی رہ جائیگا اور کبھی ادا نہ ہوگا۔

یتیم پوتے ناتی | غرض فقہا نے جو حجب کی دو اصلیں لکھی ہیں ان دونوں اصلوں میں سے کسی اصل کے رو سے بھی یتیم پوتے اپنے دادا کے اور یتیم ناتی اپنے نانا کے ترکے سے کبھی محروم نہیں ہو سکتے۔

آخر فقہا کو یتیموں سے کیوں عداوت ہو گئی؟ | عداوت تو نہیں مگر غلط فہمی ضرور ہوئی اور یہ غلط فہمی دراصل ابن جریر ابو جعفر الطبری صاحب التفسیر کی پیدا کردہ ہے۔ یعنی ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں کلالہ کے معنی یہ لکھے کہ من لا ولد لہ ولا والد یعنی جس کے نہ والد ہو نہ ولد وہی کلالہ ہے۔ اور پھر ایک دشواری ان کی نظر کے سامنے اور بھی تھی وہ یہ کہ کلالہ ہی کے وارثوں میں بھائی بہن کے حصے دو جگہ مذکور ہیں۔ ایک تو سورۂ نساء کے دوسرے رکوع میں جس میں پورا قانون وراثت تفصیل درج ہے۔ یہاں صرف ایک بھائی یا بہن ہو تو اس کو چھٹا حصہ ورنہ ایک سے زیادہ ہوں تو دو سدس یعنی تیسرا حصہ دلوایا ہے۔ اور پھر آخر سورۂ نساء میں یعنی اس سورہ کی ایک سو چھترویں آیت میں جب لوگوں نے کلالہ کے بھائی بہن کا حصہ دریافت کیا ہے تو بھائی بہن کو بالکل اپنی اولاد کی طرح حصے دلوائے ہیں یعنی صرف ایک بہن ہو تو اس کو صرف ایک بیٹی کی طرح نصف دلوایا، دو یا دو سے زیادہ بیٹیوں کی طرح بہنیں بھی اگر دو یا دو سے زیادہ ہوں تو انھیں دو ثلث دیئے گئے اور بھائی بہن مخلوط ہوں تو بیٹا بیٹی مخلوط کی طرح مرد کو دو عورتوں کے برابر کے حساب سے ملے گا۔ یوں ہی بتایا گیا ہے۔ مفسرین اور فقہا بہت گھبرائے کہ مورث کلالہ کا ذکر دونوں جگہ ہے اور دونوں جگہ کلالہ کے وارث بھائی بہن ہی ہیں مگر ایک جگہ ایک ہو تو صرف ایک سدس ملتا ہے بھائی ہو یا بہن، اور دوسری جگہ کلالہ ہی کے بھائی ہی صرف ہو تو پورا مال، صرف ایک بہن ہو تو نصف مال ایک سے زیادہ صرف بہنیں ہوں تو دو ثلث بھائی بہن مخلوط ہوں تو للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق سارا مال وہی سب لے لیتے ہیں۔ اس کی کوئی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔

امام رازی تفسیر کبیر میں سورۂ نساء کے دوسرے رکوع کی تفسیر لکھتے ہوئے جب وَاِن کان رجل یورث کلٰلۃ او امراۃ ولہ اخٌ الایہ پر پہنچے ہیں تو لکھتے ہیں کہ مفسرین کا اجماع ہے کہ یہاں اَخٌ اور اَوْ اخت سے اخیافی یعنی ماں کی طرف سے اپنے اور باپ کی طرف سے سوتیلے بھائی بہن مراد ہیں جن کی ماں ایک ہو اور باپ دو۔ اور اس اجماع مفسرین کو صحیح ثابت کرنے کیلئے حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کی قرأت بھی سند میں پیش کردی کہ وہ سارے صحابہؓ کے اجماع کے خلاف اس آیت میں ولہ اخ کے بعد من امٍ اور پھر اَوْ اُختٌ کے بعد بھی غالباً مِنْ اُمٍّ کے اضافے کے ساتھ پڑھتے تھے۔

یہ روایت صرف ابن جریر طبری کی من گھڑت ہے جس کو انھوں نے یعلی بن عطاء عن القاسم بن ربیعہ بن عابث عن سعد کرکے روایت کی ہے۔ یہ ہے تو ایک ہی روایت۔ مگر چار طریقوں سے روایت کرکے بزعم خود تعدد طرق بھی دکھلا دیا ہے۔ اگر ابن جریر کی من گھڑت یہ روایت نہیں ہے تو یعلی بن عطاء کا خود ساختہ علیہ ضرور ہے۔ اگر ابن جریر طبری کو ائمہ رجال نے شیعہ لکھا ہے اور حافظ سلیمانی نے کان

لہ یتیم طفل بے پدر کو کہتے ہیں۔ طفل بے مادر پر یتیم کا اطلاق مجازاً ہیں نے پوتے کے ساتھ ناتی کے لئے بھی کر دیا ہے۔ اس کا اطلاق جواری سمجھے۔ بعض لوگ طفل بے مادر کو "بسیر" کہتے ہیں۔

یضع للروافض یعنی "یہ رافضیوں کیلئے حدیثیں گھڑا کرتے ہیں" لکھا ہے تو یعلی بن عطاء کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں ان کا بھی ترجمہ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ امام فن رجال علی بن المدینی یعلی بن عطاء کے متعلق لکھتے ہیں کہ لہ احادیث لم یروھا شیوخ ورجال لم یرو عنھم غیرہ واھل الحجاز لا یعرفونہ۔ یروی عنہ قوم بواسط۔ یعنی ان کی بعض خاص حدیثیں ایسی ہیں جن کی روایت ان کے سوا کوئی بھی نہیں کرتا۔ اور کچھ ایسے شیوخ بھی ہیں جن سے ان کے سوا کوئی بھی روایت نہیں کرتا۔ اور اہل حجاز ان کو بالکل نہیں پہچانتے۔ واسط کے کچھ لوگ ان سے روایت کیا کرتے ہیں۔ ابن جریر نے یعلی بن عطاء سے جو چار طرق سے روایت کی ہے ان میں تین طرق میں قراءت کی تصریح نہیں ہے۔ بلکہ ولہ اخ کی تفسیر میں سعد کا لامہ بتانا مذکور ہے۔ مگر چوتھی روایت جس میں خود سعد کا ولہ اخ کے بعد من امہ کا لفظ پڑھنا مذکور ہے وہ روایت واسطی کے ایک شخص ہشیم بن بشیر الواسطی سے مروی ہے جو مشہور مدلس تھے یعنی راویوں کے ناموں میں اور متن حدیث میں الٹ پلٹ قصداً کیا کرتے تھے۔ اسی لئے بعض ائمہ حدیث نے صاف لکھ دیا ہے کہ التدلیس کذب یعنی تدلیس کذب ہی کا ایک دوسرا نام ہے۔ ان چاروں طرق سے جو یہ ایک روایت ابن جریر نے یعلی بن عطاء کی لکھی ہے۔ قاسم بن ربیعہ بن عائش سے مروی ہے انھوں نے حضرت سعدؓ کو غالباً دیکھا بھی نہ ہوگا۔ ان سے کچھ سنا کہاں تک ہوگا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کی وفات ۵۰ھ میں کوئی لکھتا ہے، کوئی ۵۴ھ میں اور کسی نے ۵۸ھ میں لکھا ہے باقی اقوال کو خود مورخین نے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ قاسم بن ربیعہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے وقت میں جوان تھے۔ نجاشی مشہور شیعہ محدث نے ان کا سال وفات ۱۳۹ھ لکھا ہے۔ حضرت سعد کی وفات اور ان کی وفات کے درمیان کم سے کم چوراسی برس کا فاصلہ ہے۔ اگر انھوں نے نوّے برس کی عمر بھی پائی تھی تو پانچ چھ برس کی عمر میں حضرت سعد سے ایک مخصوص قراءت جو ان کے سوا کسی صحابی کی نہ تھی سُن کر یاد رکھنے کی صلاحیت کب ہو سکتی ہے۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ حضرت سعدؓ وادی عقیق میں رہا کرتے تھے اپنے آخر زمانے میں وہیں ایک مکان بنا لیا تھا، اسی مکان میں وفات پائی لاش مدینہ میں لائی گئی اور بقیع میں مدفون ہوئے۔

اور قاسم بن ربیعہ غطفانی تھے، بنی غطفان کا بڑا مرکز تو کوفہ تھا مگر کچھ لوگ بصرہ میں بھی رہتے تھے۔ قاسم بن ربیعہ کوفے میں پیدا ہوئے ان کو پانچ چھ برس کی عمر میں وادی عقیق پہنچکر حضرت سعد سے قرآن سننے کا کس طرح موقع مل سکتا ہے؟ غرض یہ روایت ہی یعلی بن عطاء کی ورنہ خود ابن جریر کی من گھڑت ہے۔ اب میں ہر مسلمان سے پوچھتا ہوں کہ قرآن مجید کی متفق علیہ متواتر قراءت جس کی قطعیت صحت پر عہد نبوی سے لیکر اس وقت تک پونے چودہ سو برس کا ہر صحابی، ہر تابعی، ہر تبع تابعی، ہر امام، ہر محدث، ہر قاری، ہر فقیہ، ہر مجتہد اور ہر مسلمان کا مسلسل و متواتر ایمانی و اقراری اجماع چلا آرہا ہے، ایسی قراءت متواترہ کے خلاف ایک خلاف عقل و درایت قراءت جو صاف اللہ کی کتاب میں تحریف کی حیثیت رکھتی ہے۔ تنہا قاسم بن ربیعہ الکوفی جیسے مدلس سے سن کر یعلی بن عطاء الطائفی تنہا روایت کرتے ہیں جو خود نئے نئے لوگوں سے نئی نئی حدیثیں روایت کیا کرتے ہیں جنھیں ان کے سوا کوئی روایت نہیں کرتا۔ اہل حجاز جن کو پہچانتے تک نہیں اور پھر جس کو ابن جریر جیسا شیعہ اپنی تفسیر میں درج کرتا ہے جس پر رافضیوں کی حمایت میں جھوٹی حدیثیں گھڑنے کا الزام حافظ سلیمانی جیسے شیخ المحدثین نے دیا ہے۔ اگر صرف ایسی روایت کی بنا پر قرآن مبین کے عموم نص صریح کے خلاف

تمام مفسرین وفقہاء نے اجماع کرلیا تو وہ چودہ سو برس کا عہد نبوی سے لیکر ساری امت کا اس وقت تک کا اجماع کیا باطل ہو جائیگا؟ کیا قرآن مبین میں ایک لفظ کی کمی تھی جس کو ابن جریر نے یعلی بن عطاء و قاسم بن ربیعہ کی مدد سے پورا کردیا؟ کیا قرآن مبین کی یہ متواتر قرأت جس کو پورے چودہ سو برس سے آج تک ہر مسلمان پڑھتا چلا آرہا ہے، اپنے مفہوم صحیح کے ادا کرنے سے قاصر و عاجز ہے؟ معاذ اللہ من ذلک! میں اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھ کر قرآن مجید کی قرأت متواترہ کے خلاف سارے مفسرین وفقہاء کے مجمع علیہ قول کو جو بربنائے قرأت باطلہ ہے انتصاراً للقرآن المجید سرپائے حقارت سے ٹھکرا دینے کے لئے تیار ہوں، مگر قرآن مجید میں کسی طرح کی تحریف و اضافہ کو برداشت نہیں کرسکتا۔ چاہے اس کے لئے میرے سر پر آرہ ہی کیوں نہ چلا دیا جائے۔ اگر کوئی میرے ساتھ مباہلہ کرے تو میں اس کے ساتھ مباہلہ کرنے کے لئے تیار ہوں کہ یہ ولہ اخ کے بعد من ام یا لام یا لامہ وغیرہ کے اضافے جو بعض صحابہ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں غلط ہیں ان صحابہؓ پر اتہام ہے اور یہ تحریف فی کتاب اللہ ہے۔ کسی صحابی کی طرف بھی اس کی نسبت صحیح نہیں۔

بھائی بہن نہیں عہدی وارث

بعض حضرات کے دل میں یہ بات کھٹکی اور وہ بھی یہ سمجھے کہ یہ من ام یا لام وغیرہ کا اضافہ یہاں پر صحیح نہیں۔ مگر پھر وہ خلش انھیں بھی پیدا ہوئی جو مفسرین کو پیدا ہوئی تھی کہ اگر عام طور سے ہر قسم کے بھائی بہن یہاں اس بارہویں آیت میں بھی مراد لیں اور پھر آخر سورہ کی ایک سو چھترویں[۱۷۶] آیت میں بھی تو پھر کہیں تو بھائی بہن کو اتنا کم دلوایا جائے اور کہیں بالکل اپنی اولاد کی طرح سب کچھ انھیں کو دلوا دیا جائے اس کی کیا وجہ ہے؟ انھوں نے اس پر یہ خیال کیا کہ یہاں بھائی بہن کا حصہ ہی مذکور نہیں ہے بلکہ یہاں صرف عہدی وارث مراد ہیں جن سے میت نے عہد کیا تھا کہ تم مرو تو میں تمہارا وارث اور میں مروں تو تم میرے وارث۔ یہاں انھیں لوگوں کا حصہ معین کرکے بتایا گیا ہے۔ بھائی بہن کا ذکر صرف اسلئے آگیا ہے کہ کلالہ ان کے نزدیک بھی بے والد و بے ولد میت کو کہتے ہیں اسلئے والد و ولد کا تو یہاں خطرہ ہی نہیں، اگر بھائی بہن ہوں تو کیا بھائی بہن اس عہد و معاہدہ والے وارث کو محجوب کردینگے؟ ایسا نہیں ہے بلکہ بھائی بہن کے ہوتے بھی ان عہدی وارثوں کو اگر ایک ہو تو ایک سدس، ایک سے زیادہ ہوں تو دو سدس ملیں گے۔ غرض باوجود اس کے کہ سورۂ نساء کے اس دوسرے رکوع میں دو دو جگہ بھائی بہن کا ذکر آیا۔ پہلے گیارہویں آیت میں باپ ماں کی وراثت اور حصول کے ضمن میں کہ وہاں بھائی بہن کی وجہ سے ماں کا حصہ گھٹ کر ایک ثلث سے ایک سدس ہو جائے گا اور باپ کو جو عصوبتہ دو ثلث یعنی چار سدس ملتے وہ بھائی بہن کی وجہ سے پانچ سدس مل جائیں گے۔ گویا بھائی بہن کا وجود صرف ماں کو نقصان اور باپ کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہے مگر خود ان کو اس کی وجہ سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ ان کو ایک حبہ بھی مل سکتا ہے۔ اسلئے کہ باپ، بھائی بہن کے لئے حاجب ہے۔ باپ کے ہوتے وہ بالکل محروم الارث ہے۔ بھائی بہن تو صرف کلالہ ہی کے وارث ہوتے ہیں۔ اور کلالہ اسی کو کہتے ہیں جس کے نہ والد ہو نہ ولد یعنی اس باب میں یہ حضرات بھی عامۂ مفسرین وفقہاء کے بالکل ساتھ اور ہمخیال ہیں۔

دوسری جگہ جو بھائی بہن کے ذکر کی یہاں اس بارہویں آیت میں ہے عامۂ مفسرین وفقہاء کے نزدیک تو من ام کا لفظ چھوٹا ہوا تھا جس کو ابن جریر نے حاصل کرکے مفسرین وفقہاء کے حوالے کردیا۔ اس لئے یہاں بھائی بہن تو مراد ہی مگر اخیافی۔ اور جن حضرات کی طرف

اور اشارہ کیا گیا ہے وہ بھی یہاں بھائی بہن کے حصے کا تذکرہ نہیں تسلیم کرتے۔ غرض قانونِ وراثت کی یہ دونوں آیتیں سورۂ نساء کے دوسرے رکوع کی یعنی گیارہویں اور بارہویں آیتیں اتریں تو ہر قسم کے وارثوں کے حصے بیان کر دیئے گئے ادائے قرض و ادائے وصیت کا بھی تقسیم میراث سے پہلے کر دینے کی تاکید بار بار کی گئی۔ عام مفسرین و فقہا کے نزدیک اخیافی بھائی بہن کے حصے بھی بیان کر دیئے گئے اور محولۂ صدر حضرات کے نزدیک تو یہاں بھی صرف ان بدنصیب بھائی بہن کا ذکر ہی فقط آ گیا ان کو کچھ دلوایا نہیں گیا ہے۔ یہاں تک کہ پورا بیان کر کے سلسلہ بیان ختم کر دیا جاتا ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ الآیہ یعنی قانونِ وراثت کی آخری حد بقول عامۂ فقہاء و مفسرین صرف اخیافی بھائی بہن کے حصوں پر اور بقول دیگر حضرات صرف عہدی وارثوں کے حصوں پر ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد ہر شخص یہی سمجھنے پر مجبور ہے کہ مذکورہ ورثاء کے سوا اور کوئی دوسرا وارث کسی میت کا عنداللہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ کئی مہینے گزر جاتے ہیں، وہ جاڑوں کا موسم جس میں سورۂ نساء کی گیارہویں بارہویں آیتیں ہی اتری تھیں وہ موسم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اب جب گرمی کا موسم آ گیا تو حسن اتفاق سے بعض صحابہؓ کو خیال آ گیا کہ سب کا حصہ تو بیان کیا گیا یہاں تک کہ بقول مذکورہ بالا حضرات عہدی وارثوں تک کا حصہ بیان کیا گیا دو دو بار بھائی بہن کا ذکر بھی کیا گیا مگر ان کم نصیبوں کے لئے کچھ بھی ارشاد نہ فرمایا گیا، ہر بھائی بہن کی زبان کہہ رہی ہے کہ

کیا خاک ہو شگفتہ مرا دل کہ یہ کلی شاید زیادہ رفتۂ فصل بہار ہے

تو ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کلالہ کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا گیا۔ جن کے وارث صرف بھائی بہن ہی ہوں تو فرمایا گیا کہ یستفتونک ۔ قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ ان امرؤ ھلک لیس لہ ولد ولہ اخت الآیہ۔ لوگ تم سے پوچھتے ہیں، تو کہہ دو کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے کہ ایک شخص مر گیا لاولد اور اس کے ایک بہن ہے الخ۔ لوگ پوچھتے ہیں تو بتا دو یہ کہہ کر بتانا صاف بتا رہا ہے کہ اگر لوگ نہ پوچھتے تو نہ بتایا جاتا، یہ آیت آخر سورہ کی ہے اور گنتی میں ایک سو چھترویں آیت ہے۔ خیال تو فرمایئے، نعوذ باللہ کیا اللہ تعالیٰ بھائی بہن کا حصہ بتانا بھول گیا تھا؟ کہ لوگوں کے پوچھنے سے بتایا اتنے دنوں کے بعد آخر سورہ میں؟ اس کی وجہ نہ اگلے مفسرین نے بتائی نہ ان کے ہم خیال متاخرین نے۔ حالانکہ وما کان ربک نسیا سب پڑھتے اور رٹتے ہیں۔ پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ لوگ پوچھتے ہیں تو کہہ دو جس سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ اگر نہ پوچھتے تو نہ بتایا جاتا۔

حقیقت حال | یہ ہے کہ آیۃ الشتاء یعنی جاڑے کے موسم میں جو آیت وان کان رجل یورث کلٰلۃ ولہ اخ الآیہ اتری تھی اس میں نہ اخیافی بھائی بہن صرف مراد ہیں نہ عہدی وارث۔ یہاں بھی عام بھائی بہن ہی مراد ہیں جس طرح آخری آیت میں عام بھائی بہن مراد ہیں۔ مفسرین و فقہا جو آیۃ الشتاء یعنی پہلی آیت میں اخیافی، اور آیۃ الصیف یعنی آخری آیت میں عینی و علاتی مراد لیتے ہیں، یہ قرآن میں تحریف صریح ہے۔ جس کی کوئی دلیل قطعی ان کے پاس نہیں ہے۔ اور دوسرے حضرات جو اس آیۃ الشتاء یعنی پہلی بارہویں آیت میں عہدی بھائی کی وراثت ثابت کرتے ہیں اور ان کان رجل یورث کلالۃ کا ترجمہ فرماتے ہیں "اگر کوئی مرد کسی کلالہ کا وارث بنا دیا جائے یا کوئی عورت، بحالیکہ[*] اس کلالہ کے کوئی بھائی یا بہن ہو تو اس مرد یا عورت میں سے ہر ایک کو ایک

نوٹ: "بحالیکہ" کا لفظ تو بتا رہا ہے کہ ان حضرات کے قول کے مطابق عہدی وارثوں کو بھی حصہ مل سکتا ہے کہ اس کلالہ کے بھائی یا بہن ہوں۔ اگر بھائی بہن نہ ہوں تو عہدی وارثوں کو کچھ حصہ نہیں ملے گا۔ یہاں ترجمہ میں تو "بحالیکہ" لکھا گیا مگر مفہوم فرمایا "اگرچہ" کا، جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

ایک سدس ملے گا۔" میں نے بہت غور کیا، مگر کسی طرح سے بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ اس آیت کا یہ ترجمہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ اس کی پوری بحث میری کتاب المنقذ من الضلالۃ میں تفصیل کے ساتھ ہے۔ سردست جو میرا موضوع ہے اس کی بحث اتنی تفصیل کی متحمل نہیں۔ اگر ضرورت سمجھی گئی تو بعد کو مختصر طور سے عرض کردوں گا۔ مفصل طور سے تو اصل کتاب میں موجود ہی ہے۔ گو کتاب قلمی ہے، چھپی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چھپوا دے۔

اس کے بعد میں بخیال اختصار چند باتیں نمبروار درج کرتا ہوں، ان نمبروں سے حقیقت امر پر صاف روشنی پڑ جائیگی انشاءاللہ تعالیٰ۔

(۱) وان کان رجل یورث کللۃ الآیۃ اس جملے کا عطف فان لم یکن لہ ولد وورثہ ابوہ کے سوا اور کسی جملۂ سابقہ پر نہیں ہو سکتا جس کے وجوہ ودلائل کتاب المنقذ من الضلالۃ میں بالتصریح مذکور ہیں۔

(۲) یورث مجرد ہے۔ باب افعال سے نہیں ہے۔ اور رجل کی صفت ہے۔ رجل یورث موصوف وصفت مل کر کان کا اسم ہے، اور کللۃ، خبر۔ جملے کا ترجمۂ صحیح یوں ہے" جو شخص موروث ہو رہا ہے اگر کلالہ ہو" غیر وارث اگر وارث بنایا جائے تو اس کیلئے باب تفعیل ہے افعال نہیں۔

(۳) یورث فعل مجہول ہے، اس لئے اس کی نسبت مفعول کی طرف ضرور ہے، مگر آخر اس کا کوئی نہ کوئی فاعل تو ضرور ہوگا۔ پھر یہاں وہ فاعل کون ہو سکتا ہے؟ اس کو ڈھونڈیئے جملۂ معطوف علیہا میں۔ جملۂ معطوف علیہا میں ہے وَرِثَہٗ اَبَوٰہُ۔ یہاں سے معلوم ہو گیا کہ رجل یورث میں یورث کے فاعل اَبَوان ہیں۔ یعنی وہ میت لاولد مرد جس کے وارث اس کے اَبَوان ہو رہے ہیں، یا اپنے ابوان کا جو موروث ہو رہا ہے، اگر کلالہ ہو۔

(۴) کلالہ کس کو کہتے ہیں سورۂ نساء کی آخری آیت میں خود بتا دیا ہے: قل اللہ یفتیکم فی الکللۃ ان امرؤٌ ھلک لیس لہ ولد ولہ اخت (او اخ او کلاھما) یعنی جس میت لاولد کے وارث بھائی بہن ہوں وہی کلالہ ہے۔ کلالہ کے مفہوم میں صرف دو شرطیں ہیں ایک تو لاولد ہونا، دوسری شرط بھائی بہن کا ہونا لاولد ہونا شرط نہیں۔ ہو، یا نہ ہو۔

(۵) کلالۂ تام، یا کامل وہ ہے جس کے وارث نسبی صرف بھائی بہن ہوں اور کوئی نہ ہو۔ اور کلالۂ ناقص وہ ہے جو کسی وارث کے مقابلے میں کلالہ ہو کسی وارث کے مقابلے میں کلالہ نہ ہو۔

(۶) کلالہ کا لفظ وارث کیلئے بھی آتا ہے، موروث کیلئے بھی آتا ہے، اور وراثت کیلئے بھی آتا ہے۔ بھائی بہن وارث کلالہ ہیں جس میت کے وارث بھائی بہن ہوں وہ میت موروث کلالہ ہے۔ اور بھائی بہن کی وراثت، وراثت کلالہ ہے۔

(۷) والدین کے ہوتے اگر بھائی بہن بھی ہوں تو میت صرف بھائی بہن کے مقابل کلالہ ہے۔ یعنی کلالۂ موروث بھائی بہن کیلئے ہے اور وہ بھائی بہن کلالہ ہوں گے اور ان کی وراثت کلالہ ہوگی۔ والدین کے مقابل وہ میت کلالہ نہ ہوگا۔ نہ والدین کلالۂ وارث ہوں گے نہ والدین کی وراثت کلالہ ہوگی۔ اسی لئے میں نے ایسے میت لاولد کو جس کے والدین بھی ہوں اور بھائی بہن بھی کلالۂ ناقص قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ موروث اپنے بعض وارثوں کے مقابل تو کلالہ ہے اور بعض وارثوں کے مقابل کلالہ نہیں ہے۔

ہاں اگر والدین بھی نہ ہوں، صرف بھائی بہن ہی ہوں تو ایسا مورث مستقل طور سے کلالہ کامل ہے۔ اسی لئے قرآن مبین میں جہاں والدین کے ہوتے بھائی بہن وارث ہوتے ہوں، وہاں بہ طریقۂ بیان اختیار فرمایا کہ وان کان رجل یورث کلٰلۃ یعنی اور اگر وہ شخص جو والدین کا موروث ہو رہا ہے کلالہ ہو۔ یعنی ولد اخ او اخت اور اس کے بھائی یا بہن بھی ہوں۔ اور جہاں مستقل کلالہ یعنی کلالہ کامل کا ذکر ہے۔ یعنی جو خود بہمہ تن موروث کلالہ، جس کے کل وارث، وارث کلالہ اور جس کی وراثت بالکل وراثتِ کلالہ ہے، ہر حیثیت سے وہ کلالہ ہی کلالہ ہے۔ اس کو مستقل کلالہ کی حیثیت سے ذکر کیا۔

حال وتمیز کی ترکیب

اسی بنا پر بعض علمائے نحو نے رجلٌ کو کان کا اسم، یورث کو اس کی خبر اور کلٰلۃً کو یورث کی ضمیر کا حال یا تمیز قرار دی ہے۔ جس کی وجہ سے ترجمہ یوں ہوگا "اور اگر کوئی مرد موروث ہو رہا ہو درآنحالیکہ وہ کلالہ ہو۔ یا کلالہ کی حیثیت سے"۔۔۔ حال کی ترکیب سے تمیز کی ترکیب زیادہ واضح ہے۔ مغنی اللبیب جلد دوم ص۲۱۷ مع شرح دسوقی میں اس پر بحث کی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ حال کہئے تو مطلب یہ ہوگا کہ کوئی شخص موروث ہو بحالت کلالگی یعنی وہ کلالہ مستقل نہ ہو مگر کسی وقت کلالہ بن گیا ہو۔ اسی طرح تمیز کی صورت میں بھی مطلب یہ ہوگا کہ کوئی شخص کسی وارث کے مقابل کلالہ کی حیثیت سے موروث ہو۔ یعنی کلالہ مستقل نہ ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کا صحیح تعلق اوپر سے معلوم نہ کر لینے کی وجہ سے نحویوں کو حال یا تمیز کا شبہ ہوا ورنہ رجل موصوف یورث صفت، موصوف وصفت مل کر کان کا اسم ہوا اور کلٰلۃ خبر۔ بس یہی اور صرف یہی ترکیب صحیح ہے۔ اس کے سوا کھینچ تان کے سوا کچھ نہیں۔ اگرچہ حال وتمیز کی ترکیب سے بھی میرے مفہوم کی تائید ہی ہو رہی ہے۔ مگر میں غلط تائید بھی پسند نہیں کرتا۔

(۸) مذکورہ بالا سات نمبروں سے یہ واضح ہو گیا کہ کلٰلۃ اسی لاولد مردے کو کہتے ہیں جس کے بھائی بہن ہوں۔ اگر بھائی بہن بھی نہ ہوں تو باپ کے ورنہ دادا کے۔ یا ماں کے یا نانا کے بھائی بہن ہوں۔ غرض یہ کہ اپنی اولاد نہ ہو تو اس میت کے قریب تر اصول میں سے کسی کی اولاد وارث ہو بوجہ انھیں کے اقرب ہونے کے۔ تو وہی کلالہ کامل ہے۔ جدی اقربین کو مادری اقربین پر ترجیح ہوگی، مگر والدین کے ہوتے میت کے بھائی بہن کے سوا اور کسی کے بھائی بہن کو وراثت کا حق نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ والدین کے ہوتے والدین کے یا والدین کے والدین کے بھائی بہن بعید تر ہونے کی وجہ سے ضرور محروم ہو جائیں گے اور والدین ان کے حاجب ٹھہریں گے۔

(۹) اصل توریث جو قرآن ہی سے مستنبط ہے حسب ذیل ہے:۔

اصل وارث میت کی اولاد ہے جن میں مرد کو فوقیت ہے۔ اگر صرف مرد ہو تو کل مال اسی کا ہے۔ صرف ایک عورت یعنی بیٹی ہو تو نصف مال اس کا ہے۔ ایک سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو دو ثلث مال ان کو ملے گا۔ بیٹا بیٹی دونوں ہوں تو للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق بیٹی کو ایک حصہ اور بیٹے کو دو حصے۔

اولاد کے ہوتے والدین بھی ہوں تو ہر ایک کو ایک سدس دینے کے بعد باقی مال اولاد پر تقسیم ہوگا۔ اس وقت باپ ماں برابر کے شریک ہیں، موقوفان ہونے کی وجہ سے ان کے حصے میں کمی بیشی نہ ہوگی۔ اسلئے کہ ماں کا حق بھی اولاد پر باپ سے کم نہیں ہے۔ باپ درجے میں افضل ہے مگر حقوق ماں کے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ حملتہ امہ کرھا ووضعتہ کرھا وحملہ وفصالہ ثلثون شھرا۔ اس (بچے) کو اس کی ماں نے

تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف سے جنا۔ اور اس کے آغاز حمل سے دودھ بڑھائی تک تیس مہینے ہوتے ہیں (سورۂ احقاف ج ۲۶ رکوع ۲) یہ زحمتیں باپ نے اولاد کے لئے کہاں کھینچیں اسلئے اللہ کی رحمت نے یہ گوارا نہ کیا کہ ماں کو سدس سے بھی کم یعنی اس کا نصف بارہواں حصہ باپ کے مقابل ملے۔ اور نہ یہ مناسب تھا کہ باپ کو دو سدس دلوا دیا جائے۔ ایسا کیا جاتا تو ڈیڑھ ثلث یعنی نصف مال والدین کو ملتا اور نصف ہی ڈیڑھ ثلث اور کیلئے بچتا۔ اولاد جو فطرتاً وراثت کیلئے پیدا ہی کئے گئے ہیں ان کا حصہ دوسروں سے کم نہیں ہونا چاہئے۔ اولاد کا تو تعدد بھی ہوتا ہے اور والدین میں کسی کا بھی تعدد ممکن ہی نہیں۔ والدین سے میت کا مال پھر میت کی اولاد کے عوض زیادہ امید ہے کہ بھائی بہن تک منتقل ہو جائے۔

یہیں سے یہ مسئلہ بھی مستنبط ہو گیا کہ ورثاء کے ہوتے غیر وارث کے لئے وصیت ثلث مال سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے[1]۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ہوتے دوسرے ورثاء کو ثلث سے زیادہ نہیں دلوایا۔ شوہر کو ربع اور بیوی کو اولاد کے ہوتے ثمن ہی دلوایا۔ باپ ماں کو ربع اور ثمن کا درمیانی حصہ یعنی سدس دلوایا۔ باپ ماں دونوں ہوں تو دو سدس یعنی ایک ثلث مال کا نکل جائیگا اور اولاد کیلئے صرف دو ثلث رہ جاتے ہیں اسلئے ورثاء کے ہوتے غیر وارث کے لئے یا صدقہ و خیرات وغیرہ کیلئے کوئی وصیت کرے تو اس کو ثلث مال سے زیادہ کی وصیت نہیں کرنی چاہیئے۔ رسول اللہ صلعم کا کوئی دینی حکم ایسا نہیں ہو سکتا جو قرآن سے مستنبط نہ ہو۔

اور اگر اولاد نہ ہو تو والدین اولاد کے قائم مقام ہو جاتے ہیں۔ ایک ثلث ماں کو دلوا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد باپ کے حصے کی تعیین کی ضرورت نہ تھی، باقی دو ثلث اب باپ کے سوا کون لے گا؟ اور ہے کون؟ ہاں اگر لا ولد میت کے والدین کے ساتھ میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو جو پوزیشن اولاد کے ساتھ والدین کا تھا، وہی پوزیشن والدین کے ساتھ میت کے بھائی بہن کا ہو جائیگا یعنی جس طرح اولاد کے ساتھ باپ ماں میں سے ہر ایک بلا تفریق مرد و زن ایک ایک سدس پاتا تھا۔ بالکل اسی طرح باپ ماں کے ساتھ بھائی بہن بلا تفریق مرد و زن ایک ایک سدس پائیں گے۔ یہ بھائی بہن وارث کلالہ ہوں گے، ان کی وراثت بھی وراثت کلالہ ہوگی۔ اور وہ میت لا ولد بھائی بہن کے مقابل مورث کلالہ یا مورث کلالہ کہا جائے گا۔

اور اگر والدین بھی نہ ہوں، میت لا ولد و لا والد ہو، تو پھر بھائی بہن ہی اولاد کی جگہ لے لیں گے، اور بالکل اولاد ہی کی طرح بھائی بہن کو حصے للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق ملیں گے۔ اگر صرف ایک بہن ہو تو صرف ایک بیٹی کی طرح اس کو نصف مال ملے گا ایک سے زیادہ بہنیں ہوں تو ایک سے زیادہ بیٹیوں کی طرح دو ثلث ان کو ملے گا۔ صرف بھائی ہی ہوں تو صرف بیٹے جس طرح کل مال لے لیتے اسی طرح اس وقت سارا مال وہی بھائی ہی لے لیں گے۔ یہ اصول اتنا واضح تھا جو غور کرنے سے سمجھا جا سکتا تھا۔ اور اہل علم صحابہؓ سمجھ رہے تھے۔ مگر جب چند مہینوں کے بعد بعض سطحی عقل والوں نے کلالہ کا مل یعنی جس میت کے نہ اولاد ہو نہ والدین اور بھائی بہن ہی

---

[1] سوال یہ نہیں کہ کیا ہونا چاہیئے اور کیا نہیں ہونا چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن میں اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ اور بس۔ قرآن نے وصیت کو کہیں مشروط نہیں کیا۔ اسلئے ایسے غیر مشروط بین حکم کو اس طرح مقید و مشروط کر دینے کی اجازت کسی انسان کو نہیں مل سکتی۔ اسی لئے ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس قسم کی کوئی روایت رسول اللہ کی نہیں ہو سکتی جس میں دین پر اس طرح اضافہ کیا گیا ہو۔ (طلوع اسلام)

صرف ہوں تو بھائی بہن کو کیا ملے گا۔ یہ سوال کردیا اور جب سوال پیش کر دیا تو جو صحابہ سمجھ رہے تھے وہ بھی خوش ہوگئے کہ اب کچھ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے جب پوچھا گیا ہے تو پھر جواب آہی جائیگا۔ اسی لئے پہلے طنزیہ انداز میں فرمایا گیا کہ یستفتونک لوگ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ اس کے بعد یہ فرما کر کہ جب پوچھتے ہی ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیدیتا ہے۔ یہاں صرف "کلالہ" عام طور سے اس طرح فرمایا گیا ہے کہ کلالۂ موروث، کلالۂ وارث اور وراثت کلالہ سب کو شامل ہو۔ مگر کلالہ ہے کون؟ کس کو کلالہ کہتے ہیں اس کو بھی بتادیا ان امرؤ ھلک لیس لہ ولد ولہ اخت (او اخ نحو کلالۃ او امرأۃ کذلک) کہ ایک مرد یا عورت لاولد مرجائے اور اس کے بھائی یا بہن یا دونوں ہوں (خلاصۂ مفہوم آیت) آگے جو صورت بیان فرمائی گئی ہے وہ کلالۂ کامل کی یعنی جس کے وارث صرف بھائی بہن ہی ہیں۔ والدین میں سے کوئی بھی نہیں۔ مگر لیس لہ ولد کے ساتھ ولا والد نہیں فرمایا گیا۔ اسی لئے کہ کلالہ کیلئے لاوالدیت بھی لاولدیت کی طرح لازمی شرط نہ سمجھ لی جائے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جہاں کلالۂ کامل یعنی لاولد و لاوالدین کا ذکر ہو وہاں بھی صرف لیس لہ ولد کہہ کر رک جانا اور ولا والد نہ کہنا بلا وجہ نہیں ہوسکتا۔ ابن جریر کا ذہن ادھر طرف نہ گیا ورنہ ایک قرأت یہاں بھی ولا والد کی حضرت سعدؓ نہیں تو حضرت ابی بن کعب یا حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہما میں سے کسی کی طرف ضرور منسوب کردیتے۔ راویوں کا سلسلہ جوڑ دینا تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مختصر یہ ہے کہ یہاں ولا والد کا مفہوم موجود رہتے ہوئے کلالہ کے معنی بتانے میں ولا والد کا لفظ نہ کہنا اور صرف عنوان بیان سے ولا والد کا مفہوم ادا کردینا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ ولا والد ہونا کلالہ کی تعریف میں شرط لازمی نہیں ہے۔

(۱۰) کلالہ کے معنی چونکہ مفسرین نے غلط روایتوں کی بنا پر من لا والد لہ ولا ولد مان لیا ہے اور اسکی وجہ سے باپ کو بھائی بہن کا حاجب بھی ان کو ماننا پڑا۔ تو اس کے بعد جب شرائط حجب بنانے لگے تو پہلے ادلاء کی شرط لازمی بنائی کہ باپ مدلیٰ بہ ہے اور بھائی بہن مدلی۔ پھر وہ سب دشواریاں پیش آئی گئیں جن کا ذکر اوپر گذر چکا۔ جیسے جیسے دشواریاں پیش آتی گئیں قیدیں بڑھاتے گئے۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو دوسری اصل حجب کیلئے بنائی۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو مولانا عبدالحی نے مجبور ہو کر فرمایا کہ دو ہی صورتیں تو تھیں جو دونوں ناکام رہیں اب کوئی تیسری صورت اگر ہے فیجب ان یبین "تو واجب ہے کہ بیان کی جائے"۔ دیکھئے اس واجب کو کون ادا کرتا ہے۔

پس اس بھائی بہن کے لپیٹ میں بیچارے یتیم پوتے بھی آگئے۔ ورنہ خاص طور سے یتیموں کو محروم کرنا فقہاء کو مقصود نہ تھا مگر ان کی خطائے اجتہادی کا تیر ایسا چلا جس سے بھائی بہن ہی اپنے مرحوم بھائی کے ترکہ سے باپ کی وجہ سے محروم نہ ہوئے بلکہ غریب یتیم پوتا بھی اپنے دادا ترکہ سے اپنے چچا کی وجہ سے محروم ہوگیا۔ فقہا نے ایک تیر سے کتنے کلیجے چھلنی کرکے رکھدیئے۔

رکھدیا چھید کے دل، کیا یہ خطا تھوڑی ہے؟ — بے خطا کہئے کو صرف نشانہ تیرا

ثلاث عشرۃ کاملہ پہلے کی تصریحات اور پھر ان دس نمبروں سے مسئلہ حجب جو فقہاء کا متفق علیہ مسئلہ ہے اس پر کافی روشنی پڑجاتی ہے۔ یہ پوری بحث فقہاء کے متفق علیہ اصول کو ایک حد تک مانتے ہوئے انہیں حدود کے اندر کی گئی ہے۔ انشاءاللہ تعالیٰ اس کے بعد قانون حجب پر صرف قرآنی تصریحات کے ماتحت روشنی ڈالوں گا مگر علمائے وقت کے خیالات ان معروضات کے متعلق تو ذرا معلوم ہولیں۔

ایک گذارش: جو بزرگ اس مضمون پر موافقت یا مخالفت میں قلم اٹھائیں اور جس پرچے میں وہ مضمون چھپے اس کی ایک کاپی میرے پاس بھی ضرور بھیجکر مجھے اس سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔ والسلام

(تمنا عمادی مجیبی غفرلہ)

۲۳ عبدالعزیز لین۔ نواب گنج۔ ڈاکخانہ بیل خانہ۔ ڈھاکہ

قانونِ حجب

(علامہ اسلم صاحب جیراجپوری)

جولائی کے رسالہ طلوعِ اسلام میں مولانا تمنا صاحب، کا مضمون عنوان بالا سے شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے اگرچہ میرا نام نہیں لیا ہے مگر اعتراضات میرے ہی اوپر کئے ہیں۔ میں نے سورۂ نساء کی آیت ۱۲ — وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً الآیہ — کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فقہ فرائض میں اس آیت سے جو اخیافی بھائی بہن کو ذوی الفروض قرار دیا گیا ہے صحیح نہیں ہے بلکہ اس میں عہدی وارثوں کے حصے بیان کئے گئے ہیں جن کا ذکر اسی سورہ کی آیت ۳۳ میں ہے۔

والذین عقدت ایمانکم فآتوھم نصیبھم

جن سے تمہارا عہد ہو گیا ہو ان کو ان کے حصے دو

مولانا تمنا نے یہاں تک تو مجھ سے اتفاق کیا ہے کہ اس میں اخیافی بھائی بہن کے حصے جو فقہا نے قرار دیئے ہیں صحیح نہیں ہیں مگر اس سے اختلاف کرتے ہیں کہ یہ عہدی ورثہ کے حصے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ باپ ماں کی موجودگی میں یہ مطلق بھائی بہن کے حصے ہیں مگر دلیل اس پر سوائے اپنے قیاس کے اور کچھ نہیں دیتے۔ میرے اور ان کے درمیان متنازع فیہ صورت یہ ہے:

نانا		دادا
ماں		باپ
سعیدہ (متوفی کی حقیقی بہن)	حمید (متوفی)	مسعود (متوفی کا حقیقی بھائی)

حمید نے وفات پائی۔ باپ کو چھوڑا اور دادا کو۔ ماں کو چھوڑا اور نانی کو۔ اور اپنے باپ ماں کی ایک بیٹی سعیدہ اور ایک بیٹے مسعود کو چھوڑا جو اس کے حقیقی بہن بھائی ہیں۔ مولانا تمنا باپ کو دادا کا حاجب قرار دیتے ہیں اور ماں کو نانی کا یعنی باپ کی موجودگی کی وجہ سے دادا کو وراثت نہیں ملے گی اور ماں کی موجودگی کی وجہ سے نانی کو۔ مگر یہی باپ اور ماں ان کے نزدیک اپنی بیٹی سعیدہ اور بیٹے مسعود کے حاجب نہیں ہو سکتے۔ مولانا ان کو حصہ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس لئے یہاں ان سے چند سوالات کرنے ضروری ہیں۔

(۱) آپ باپ ماں کی موجودگی میں بھائی بہن کو کس قرآنی دلیل سے حصے دیتے ہیں؟

(مولانا موصوف نے دراصل یہاں قیاس سے کام لیا ہے۔ فرماتے ہیں "باپ ماں کی موجودگی میں بھائی اور بہن ماں کا حصہ ⅙ سے ⅓ کر دیتے ہیں مگر ان کو خود اس سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ ان کو ایک حبہ مل سکتا ہے۔ اس لئے مولانا صاحب نے رحم کھا کر ان کے بھی حصے مقرر فرما دیئے۔ لیکن یہ نہ سوچے کہ بلا قرآنی سند کے یہ حصے دیئے کیسے جائیں گے۔)

(۲) سورۂ نساء کی آخری آیت میں بھائی بہن کے حصے اولاد کی طرح (نر کو مادہ سے دگنا) رکھے گئے ہیں مگر اس بارھویں آیت میں تو مذکر اور مونث کے حصے مساوی ہیں۔ اگر بقول مولانا تمنا صاحب یہاں بھی بھائی اور بہن ہی کے حصے ہیں تو تقسیم میں فرق کیوں ہے؟

(۳) قرآن نے پورے قانون وراثت کو صرف پانچ آیتوں میں بیان فرمادیا ہے۔ ان میں کلالہ کا لفظ دو جگہ آیا ہے۔ آپ نے کس دلیل سے ایک جگہ کلالہ ناقص اور دوسری جگہ کلالہ کامل مراد لیا ہے۔ ایسے نازک اور مختصر قانون سازی کے موقع پر ایک ہی لفظ کے دو معانی کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ خیال رکھئے کہ آپ کا قیاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۴) آیت ۳۳ میں آپ نے عقدیمین کا ترجمہ عقد نکاح کیا ہے۔ یہ ثبوت طلب ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ بارھویں آیت میں میاں اور بیوی کے حصے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کردیئے گئے ہیں۔ پھر آیت ۳۳ میں پہنچکر یہ فرمانا کہ جن سے تم نے عقد نکاح باندھا ہے ان کو ان کے حصے دیدو کیا معنی رکھتا ہے۔ میرے خیال میں مولانا صاحب اس آیت سے بھی سرسری گزر گئے ہیں انھوں نے یہ سوچا نہیں کہ یہ کس ضرورت سے یہاں لائی گئی اور کیا فائدہ دیتی ہے جو اس سے پہلے ہم کو حاصل نہیں تھا۔

(۵) آپ نے فرمایا ہے کہ غیر وارث اگر وارث بنایا جائے تو اس کیلئے باب افعال نہیں بلکہ باب تفعیل ہے۔ اس پر کوئی سند نہیں دی۔ نہ قرآن کی کوئی آیت پیش کی جس میں یہ لفظ باب تفعیل سے لایا گیا ہو۔ بخلاف اس کے متعدد آیات میں اس کا استعمال باب افعال ہی سے ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ شعراء میں ہے اورثناھا بنی اسرائیل۔ سورۂ احزاب میں ہے واورثکم ارضھم ودیارھم۔ سورۂ فاطر میں ہے ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

دراصل یہ خود ساختہ قاعدہ مولانا نے اپنی غلطی کی حمایت کیلئے وضع فرمایا ہے مگر یہ نہ صرف عربی زبان بلکہ قرآن پر ظلم ہے۔

ان سب غلطیوں کی وجہ یہ ہے کہ مولانا تمنا نے قرآنی وراثت سمجھنے میں جو پہلا قدم رکھا وہی غلط رکھا۔ قرآن نے نسبی رشتہ داروں کی وراثت کا سب سے پہلا بنیادی قاعدہ جو بتایا ہے وہ یہ ہے: للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون۔ وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون ـــ مردوں کو حصہ ملے گا اس مال میں سے جو ان کے باپ ماں یا کسی اقرب نے چھوڑا ہے اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس مال میں سے جو ان کے باپ ماں یا کسی اقرب نے چھوڑا ہے۔ یعنی نسبی رشتہ دار باپ۔ ماں اور اقرب کے سوا اور کسی کے ترکہ سے حصہ نہیں پاتا۔ اقرب کا مفہوم میں نے اپنے رسالہ محجوب الارث میں جو اس سے پہلے طلوع اسلام میں چھپ چکا ہے واضح کردیا ہے کہ مورث اقرب اس کا ہوگا جس سے بلا واسطہ اس کا رشتہ ہے اور اگر بواسطہ ہے تو بر وقت مورث کی وفات کے وہ واسطہ مفقود ہو۔ میں نے دلائل سے ثابت کردیا ہے کہ اس کے سوا اقرب کا کوئی دوسرا مفہوم ہو نہیں سکتا۔

اب صورت متنازع فیہ کو ملاحظہ فرمایئے۔ حمید متوفی سعیدہ اور مسعود کا نہ باپ ہے نہ ماں، نہ اقرب ہے۔ کیونکہ اس کا رشتہ ان دونوں بھائی بہن کے ساتھ بذریعہ باپ اور ماں کے ہے جو دونوں موجود ہیں۔ پھر وہ دونوں حمید کے ترکہ سے حصہ کیسے پاسکتے ہیں؟ مولانا نے یہ پہلا قدم غلط رکھا اس لئے اس کے بعد جتنے قدم رکھے سب غلط در غلط در غلط ہوتے گئے۔